March 1998 • No. 256 • Rs. 8

صبر عمل کا الٹا نہیں ہے

صبر عاجلانہ کارروائی کا الٹا ہے
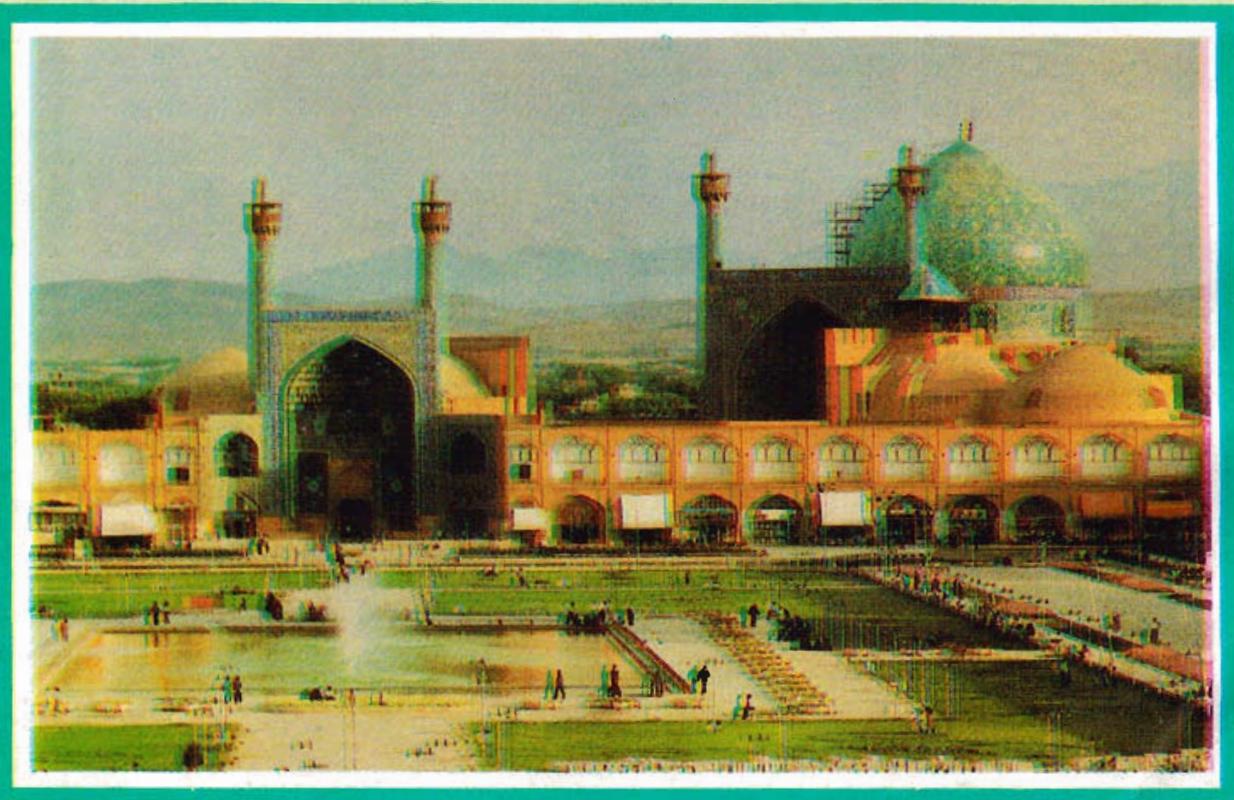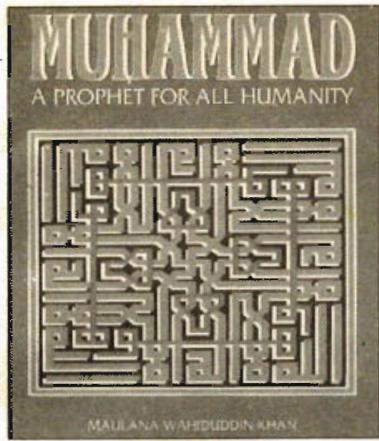
Size: 23.5×16cm,
Pages: 228; Rs. 125
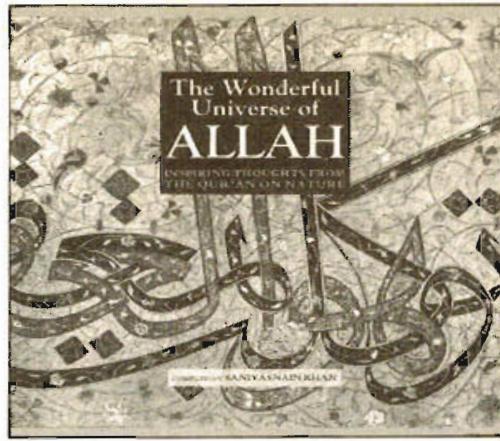
Size: 14×14cm,
Pages: 150; Rs. 95
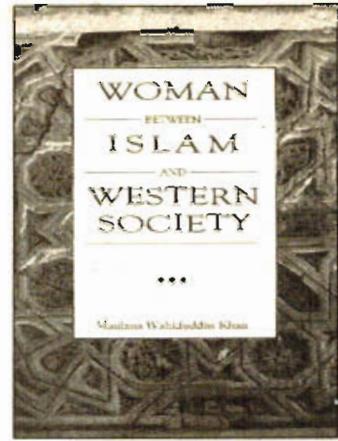
Size: 22×14.5cm,
Pages: 255; Rs. 95
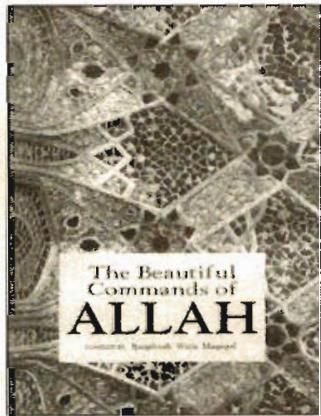
Size: 12.5×19 cm,
Pages: 192; Rs. 125
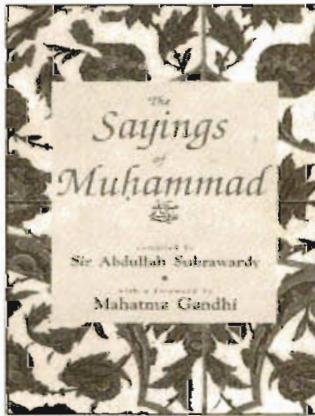
Size: 11.5×15 cm,
Pages: 128; Rs. 75
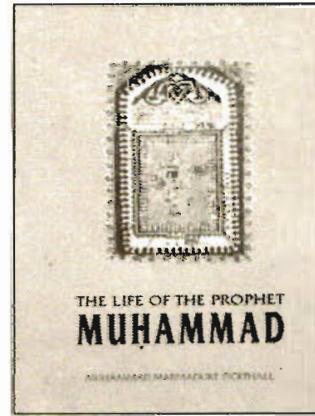
Size: 11.5×15 cm,
Pages: 64; Rs. 75
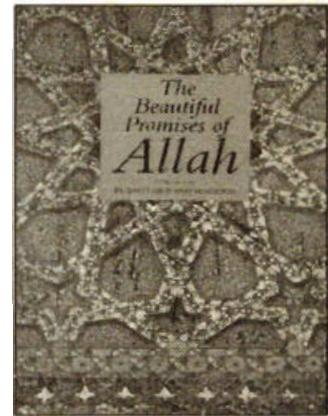
Size: 12.5×19cm,
Pages: 200; Rs. 175
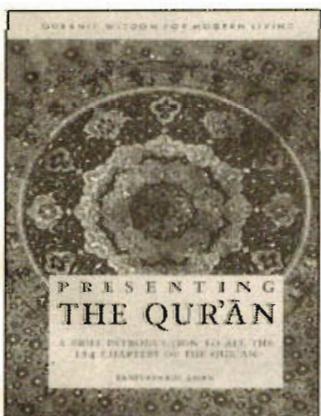
Size: 12.5×19cm,
Pages: 168; Rs. 165
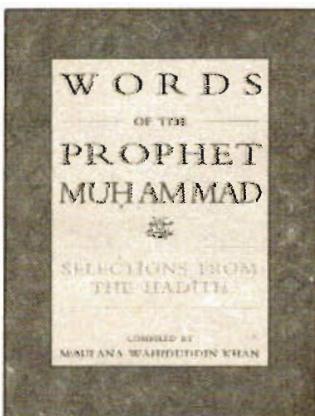
Size: 11.5×15cm,
Pages: 112; Rs. 75
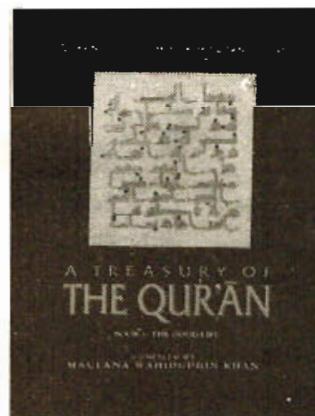
Size: 11.5×15cm,
Pages: 92; Rs. 75
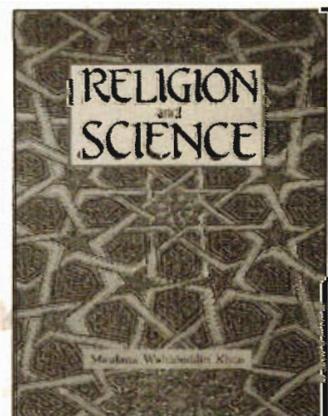
Size: 22×14.5cm,
Pages: 96; Rs. 55

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org.

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۶

صبر — بہادری ہے

صبر بہادری ہے، اور بے صبری بزدلی۔ جو لوگ صبر کرنے پر تیار نہ ہوں انھیں آخر کار بزدل بن کر اس دنیا میں رہنا پڑے گا۔ اور بزدلی کا دوسرا نام منافقت ہے جس سے زیادہ بری اخلاقی صفت اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا میں خود فطری نظام کے تحت بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے یہ ایک لازمی صورت حال ہے۔ یہ معاملہ انسانی زندگی کے آغاز ہی میں ھابیل اور قابیل کے ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ تاریخ کے ہر دور میں، حتی کہ پیغمبروں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، وہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خود اس دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

ایسی حالت میں کسی بھی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی پسند کے عین مطابق ایسی زندگی حاصل کرے جہاں اس کو نہ کسی سے شکایت ہو اور نہ کسی سے اختلاف۔ ایسا انتخاب موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، نہ صالحین کے لیے اور نہ غیر صالحین کے لیے۔

موجودہ دنیا میں حقیقی انتخاب صرف دو روش کے درمیان ہے۔ آپ یا تو گھر سے باہر تک ہر ایک سے مسلسل لڑتے رہیں یا شکایت واختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ پہلی روش اگر پھول کے درخت میں اس کے کانٹوں سے الجھنے کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں دوسری روش یہ ہے کہ کانٹے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پھول کو لے لیا جائے۔

مگر پہلی روش کسی کے لیے بھی مستقل طور پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ اپنی اور اپنے گھر کی تباہی کے ہم معنی ہے۔ اور کوئی بھی اتنا نادان نہیں کہ وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ اس لیے عملاً یہ ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش اختیار کرنے والے وقتی طور پر دوسروں سے لڑتے ہیں اور آخر کار اس کا تباہ کن نتیجہ دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں مگر ایسی خاموشی کا مطلب منافقت ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا میں آپ کو بہر حال صبر کرنا ہے۔ اگر آپ اصول کی بنیاد پر صبر نہ کریں تو آپ کو مفاد کی بنیاد پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی دوسری روش کا نام منافقت ہے۔

مبنی بر قلب

الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ ، و اذا فسدت فسد الجسد کلہ ، الا وھی القلب ۔ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/۱۵۲)

سن لو کہ جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے ۔ سن لو کہ گوشت کا یہ ٹکڑا دل ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح کا حقیقی طریقہ کیا ہے ۔ وہ یہ کہ جس طرح جسمانی اعتبار سے آدمی اس وقت صحت مند ہوتا ہے جب کہ اس کا دل ٹھیک کام کر رہا ہو ۔ اسی طرح کسی انسان کی دینی اور اخلاقی اور روحانی اصلاح اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کا فکر درست ہو ، اس کا شعور صحیح طور پر کام کرنے لگے ۔

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں ـــــ اصلاحی اور انقلابی ۔ اصلاحی تحریک فرد کی تبدیلی کو اپنا نشانہ بناتی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں جن تحریکوں کو انقلابی تحریک کہا جاتا ہے ، ان کا نشانہ سسٹم (اجتماعی نظام) کو بدلنا ہوتا ہے ۔ اصلاحی تحریک کے مطابق ، افراد کے سدھار سے اجتماعی زندگی میں سدھار آتا ہے ۔ اس کے برعکس انقلابی تحریکوں کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ نظام پر قابض لوگوں کو ہٹا کر اس کے اوپر اپنا کنٹرول حاصل کیا جائے تاکہ لوگوں کو بدلا جا سکے ۔

موجودہ زمانہ میں تبلیغی تحریک مبنی بر قلب تحریک ہے ۔ اس کے مقابلہ میں دوسری اکثر تحریکیں مبنی بر نظام کے اصول پر قائم ہیں ۔ مبنی بر نظام تحریکوں کا اصول فطرت کے خلاف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کا آخری نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھیں اور پھر کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہو جائیں ۔

اس دنیا میں کوئی نتیجہ صرف کسی ایسی تحریک ہی سے نکل سکتا ہے جو مبنی بر قلب کے اصول پر اٹھائی گئی ہو ، جو ایک ایک انسان کو اپنا نشانہ بنائے ، جو ایک ایک انسان کے اندر فکر و شعور کی روشنی پیدا کرے ، جو ایک ایک انسان کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ اس کو خدا پرست انسان بن کر دنیا میں زندگی گزارنا ہے ۔

اسلامی تحریک وہی ہے جو اسلامائزیشن آف مین کے فطری اصول پر جاری کی جائے ۔ اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کے نام پر چلائی جانے والی تحریک غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی ۔ اس کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ۔

فطری حفاظت

مائک وولڈرج (Mike Wooldridge) بی بی سی، نئی دہلی کے بیورو چیف ہیں۔ وہ ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو اپنی ٹی وی ٹیم کے ساتھ ہمارے دفتر میں آئے اور اپنی انگریزی نشریات کے لیے راقم الحروف کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔

ان کا ایک سوال یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کو عام طور پر مسلم مخالف پارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ہندستانی پارلیمنٹ کا بارھواں الیکشن جو فروری ۱۹۹۸ میں ہونے والا ہے اگر اس میں بی جے پی جیت جائے اور مرکز میں حکومت بنالے تو کیا آپ اس کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ کوئی پولیٹکل پارٹی جو الیکشن جیت کر برسر اقتدار آتی ہے وہ صرف چند سال کے لیے آتی ہے اور اس کا اقتدار کسی بھی حال میں مطلق اقتدار نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں ایک باضابطہ دستور ہے۔ ہر حکومت کو اس دستور کے تحت کام کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس سے آزاد رہ کر۔

انھوں نے کہا کہ ہندستانی دستور میں حکمراں جماعت کو ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، اسی سے فائدہ اٹھا کر اندرا گاندھی نے ۱۹۷۷ء میں یہاں ایمرجنسی نافذ کردی تھی، جس کی وجہ سے اندرا گاندھی کو مَن مانی کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اگر بی جے پی حکومت پاکر یہاں ایمرجنسی نافذ کردے تو خود اسی دستور کے مطابق اس کو لامحدود اختیارات حاصل ہوجائیں گے، اور وہ مسلمانوں کے خلاف جو چاہے گی کر سکے گی۔

میں نے کہا کہ اس قسم کا سنگین واقعہ کبھی قابل اعادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایٹم بم صرف ایک بار گرا سکتے ہیں، بار بار ایٹم بم گرانا ممکن نہیں :

Such kind of holocaust is not repeatable in human history. You cannot drop an atomic bomb again and again.

میں نے کہا کہ اسی اصول پر یقین کی بنا پر میں نے یہ جرأت کی تھی کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو میں نے یہ کہا کہ اب اس ملک میں کوئی اور مسجد ڈھائی نہیں جائے گی۔ لوگ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کو کاما سمجھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کاما نہیں ہے بلکہ یہ فل اسٹاپ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ ڈھانے والے لوگ اپنے لحاظ سے بہت سی اور مسجدوں کی فہرست بنائے ہوئے تھے، مگر فطرت کے قانون نے ان کی فہرست کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا، دوبارہ ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ کسی اور مسجد کے ساتھ ۶ دسمبر کو دُہرا سکیں۔

۶ دسمبر ۹۲ ۱۹ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ مجھے ان لوگوں پر فخر ہے جنھوں نے بابری مسجد کو ڈھایا۔ مگر اسی مہینہ کے اخبارات میں بال ٹھاکرے کا یہ بیان چھپا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پر نہ مسجد بنائی جائے اور نہ مندر، دونوں فرقوں کو اس سے الگ مقام پر مسجد اور مندر بنانے کی جگہ دے دی جائے اور جہاں بابری مسجد تھی وہاں ایک قومی یادگار تعمیر کی جائے۔ اس معاملہ میں کانگریس نے مسلمانوں سے یہ کہہ کر معافی مانگی ہے کہ اس وقت اگرچہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی، مگر ہم بابری مسجد کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی یہ اعلان کر دیا ہے کہ مندر مسجد کا اشو اب اس کے ایجنڈے میں نہیں، وغیرہ۔

اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کسی بڑی برائی کو مسلسل جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی بڑی برائی یا کوئی سنگین جرم جب کیا جاتا ہے تو فوراً ہی اس کے خلاف مانع اسباب اکٹھا ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ اس برائی یا ظلم کی تکرار ممکن نہیں رہتی۔

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ میں تمہارے سر پر آسمان گرا دوں گا۔ تو آپ کو کہنے والے سے لڑنا نہیں چاہیے بلکہ یہ سوچ کر چپ رہنا چاہیے کہ آسمان کو گرانا اس کے بس ہی میں نہیں۔ اسی طرح کوئی پولیٹکل پارٹی یا لیڈر اگر آپ کی مخالفت میں بڑے بڑے الفاظ بولے تو اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے یہ سوچئے کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر وہ ممکن نہ ہو تو آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ اپنے الفاظ کو واقعہ بنا سکے۔ یہاں جو چیز واقعہ بنتی ہے وہ حقائق ہیں نہ کہ کسی کے بولے ہوئے الفاظ۔

فطری زندگی

ایک بار میں ایک صاحب کے گھر پر ان سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں ان کے چار چھوٹے بچے (دو لڑکی، دو لڑکا) کھیل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار اپنے والد سے ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں ——— اس نے مجھے مار دیا، اس نے میرا کھلونا لے لیا، اس نے مجھے دھکیل دیا، اس نے مجھے ایسا کہہ دیا، وغیرہ۔ ان شکایتوں کے باوجود وہ سب مل کر کھیلتے رہے۔ ان کے باہمی تعلق میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

شکایتوں کے باوجود ان کی باہمی محبت کیوں باقی رہی۔ اس کی وجہ خونی تعلق ہے۔ وہ سب بھائی اور بہن تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے۔ یہ خونی تعلق شکایتوں کے اوپر غالب رہتا تھا۔ اختلاف کے باوجود وہ انھیں آپس میں جوڑے رکھتا تھا۔

یہ فطرت کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ دنیا میں لوگوں کو اس طرح رہنا چاہیے کہ ان کے درمیان اختلاف اور شکایت کی صورتیں پیدا ہوں، اس کے باوجود ان کا باہمی تعلق نہ ٹوٹے، اس کے باوجود وہ محبت کے ساتھ مل جل کر زندگی گزاریں۔

دنیا میں ایسا بہر حال ہوگا کہ جب لوگ مل جل کر رہیں گے تو ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوگی۔ شکایت کے واقعات سے خالی زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں کہ انسانی سماج شکایت کے واقعات سے خالی ہو جائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے بچایا جائے۔

بھائی بہن کے معاملہ میں جو چیز شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ خونی تعلق ہے۔ اور عام انسان کے لیے اخلاقی اصول اسی روک کا کام کرتا ہے۔ خونی تعلق ایک طبعی تقاضا ہے، اس لیے اس کے اوپر کوئی ثواب یا انعام نہیں۔ مگر اخلاقی اصول کو آدمی خود اپنے ارادہ سے اختیار کرتا ہے، ایسا آدمی خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ایک ڈسپلن میں باندھتا ہے، اس لیے جو آدمی اس اخلاقی ڈسپلن کا ثبوت دے اس کے لیے بہت بڑا انعام ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی ابدی زندگی میں بھی۔

نظام فطرت

ایک شاعر کا قطعہ ہے۔ اپنے ان دو شعروں میں اس نے نہایت سادہ طور پر زندگی کی حقیقت بتادی ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

کہا کیا اونٹ پر بیٹھوں — کہا ہاں اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے — کہا کوہان تو ہوگا
کہا دریا میں کیا اتروں — کہا دریا میں ہاں اترو
کہا طوفان کا ڈر ہے — کہا طوفان تو ہوگا
کہا کیا پھول کو توڑوں — کہا ہاں پھول کو توڑو
کہا پرخار کا ڈر ہے — کہا پرخار تو ہوگا

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت ہے۔ یہاں اونٹ ہے تو کوہان بھی ہے۔ یہاں ہموار پیٹھ والا کوئی اونٹ موجود نہیں۔ یہاں دریا میں طوفان کا مسئلہ بھی ہے، یہاں کوئی ایسا دریا نہیں پایا جاتا جس میں سکون ہی سکون ہو۔ تموج نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ ہو۔ اسی طرح یہاں خدا کے اگائے ہوئے باغ میں اگر خوب صورت پھول ہیں تو اسی کے ساتھ نوک دار کانٹے بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آدمی کوئی چیز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اس کو پیشگی طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ یہاں ترقی کا سفر کبھی ہموار راستوں سے طے نہیں ہوتا۔ یہاں مسائل پر قابو پانے کے بعد ہی کسی آدمی کے لیے کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو آدمی مسائل و مشکلات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو، اس کو خدا کی اس دنیا میں کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہ رکھنا چاہیے۔

خدا کی دنیا ویسی ہی رہے گی جیسا کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ اس کو بدلنا یقینی طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے یہاں زندگی اور کامیابی کی صرف ایک صورت ہے ــــــ یہ کہ دنیا میں قائم شدہ نظام فطرت سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لے۔ اس کے سوا ہر دوسری صورت آدمی کی ناکامی میں اضافہ کرنے والی ہے نہ کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی۔

توفیق بقدر استعداد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا تذکرہ قرآن کی سورہ نمبر ۴۸ میں آیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے :

جب منکرین نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسولؐ پر اور ایمان والوں پر۔ اور اللہ نے ان کو تقوی کے کلمہ پر جمائے رکھا، اور وہ اس کے حق دار اور اس کے اہل تھے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (الفتح ۲۶)

اس آیت سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آزمائش کی اس دنیا میں اللہ تعالٰی نے توفیق بقدر استعداد کا نظام قائم فرمایا ہے۔ گویا کہ یہ ایک قسم کا دو طرفہ معاملہ ہے۔ جس آدمی کے اندر قبولیت کی استعداد موجود ہوگی اسی آدمی تک خدا کی توفیق پہنچے گی۔ ضروری استعداد کے بغیر کسی کو خدا کی توفیق نہیں مل سکتی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر دو فریق تھے۔ ایک طرف قریش اور دوسری طرف مسلمان۔ قریش کے اندر سرکشی کا مزاج تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی طرف سے پیش کی جانے والی ہر معقول بات کا انھوں نے انکار کیا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کے اندر بھی جوابی اشتعال پیدا ہو جائے اور معاہدۂ امن کے بجائے تشدد اور جنگ کی نوبت آجائے۔ مگر صحابہ کرام نے سرکشی کے جواب میں سرکشی نہیں دکھائی۔ ان کے دل کا تقوی اس بات کی ضمانت بن گیا کہ وہ جوابی اشتعال سے بچ جائیں۔ وہ اللہ کے منصوبہ کو سمجھ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔

خدا کی طرف سے حق ظاہر کیا جاتا ہے مگر اس کے اعتراف کی توفیق وہی لوگ پاتے ہیں جو اپنے آپ کو خود پسندی کی نفسیات سے پاک کر چکے ہوں۔ خدا کی طرف سے جنتی عمل کرنے کی اعلٰی صورتیں پیدا ہوتی ہیں مگر ان صورتوں سے فائدہ اٹھانا صرف انھیں لوگوں کے لیے ممکن ہوتا ہے جو دنیا کی طلب کو اپنے دل سے نکال چکے ہوں۔ خدا کی طرف سے دعوتی کام کے مواقع کھولے جاتے ہیں مگر ان مواقع کو استعمال کرنے کا کریڈٹ انھیں لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے سینہ کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کر چکے ہوں۔

تعلیم نہ کہ طرزِ تعلیم

آزادی کے بعد ہندستان میں تعلیم کا چرچا، الفاظ کی حد تک، بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ تمام چرچا جس فکر کے گرد گھومتا رہا ہے، وہ نفس تعلیم سے زیادہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا ردعمل (Reaction) تھا۔ چنانچہ اس پوری مدت میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا گیا وہ بذاتِ خود تعلیم نہ تھی، بلکہ اس کا طرز (Pattern) تھا۔ پچھلی تقریباً نصف صدی میں ہمارے یہاں تعلیم سے زیادہ طرزِ تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل کام، قوم کو تعلیم یافتہ بنانا، یہ تو نہ ہو سکا۔ البتہ تعلیم کے نام پر اختلافات بہت زیادہ ظہور میں آگئے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

اس کے مقابلہ میں جاپان کی مثال لیجئے۔ جاپان میں دوسری عالمی جنگ کے بعد جو تعلیمی نظام رائج ہوا، وہ بنیادی طور پر امریکہ کا تجویز کیا ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ میں تعلیم کے امریکی ماہرین (American experts on educational affairs) جاپان آئے۔ انھوں نے امریکی نقطۂ نظر کے مطابق، ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام یہ تھا:

Report of the United States Education Mision to Japan. (6/392)

امریکی ماہرین تعلیم کی یہی وہ رپورٹ تھی جس کے مطابق جاپان کا نظام تعلیم بنایا گیا، اور جو آج تک کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر رائج ہے۔ بالفاظ دیگر، جاپان کی پوری جدید نسل نے "لارڈ میکالے" کے تعلیمی نقشہ کی پیروی میں تعلیم حاصل کی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو ہندستان ناکام رہا اور جاپان کامیاب رہا۔ ہندستان تمام ملکوں سے پیچھے ہے اور جاپان تمام ملکوں سے آگے۔

ہندستان طرزِ تعلیم کے پیچھے پڑا رہا، وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جاپان نے طرزِ تعلیم کے مسئلہ کو نظر انداز کر کے صرف تعلیم پر اپنی ساری توجہ لگا دی، اور وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ کسی بھی طرح قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ اس معاملہ میں طرزِ تعلیم کی اہمیت صرف اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔ اصل مسئلہ پڑھنا ہے نہ یہ کہ کیسے پڑھا جائے۔

حسن اخلاق

ہر آدمی بے اخلاق ہے اور ہر آدمی با اخلاق۔ آپ کسی بھی آدمی کا جائزہ لیجئے۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ نہایت اچھا اخلاق برتتے گا، اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی آدمی اخلاق سے خالی نظر آئے گا۔ یہی موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا کیس ہے۔

بیشتر لوگ وہ ہیں جن کا اخلاق ان کے ذاتی مفاد کے تحت کام کرتا ہے۔ جہاں ان کا ذاتی مفاد ہو اور ذاتی مصلحت کا تقاضا ہو وہاں وہ اخلاق کا پیکر بن جائیں گے۔ اور جہاں ان کا کوئی فائدہ اور مصلحت نہ ہو وہاں وہ ایسے بے حس بن جائیں گے جیسے کہ اخلاقی تقاضوں سے وہ آشنا ہی نہیں۔

انھیں میں کچھ لوگ وہ ہیں جو نسبتاً بہتر نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کا اخلاق بھی ان کی نفسیات کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سے متواضع بن کر ملے تو وہ بھی اس کے لیے متواضع بنے رہیں گے۔ ایسے آدمی کے ساتھ وہ شریفانہ اخلاق کا برتاؤ کریں گے۔ مگر جو شخص کسی وجہ سے ان کی اَنا کو ٹھیس پہنچادے تو اس کے لیے وہ اپنی ساری شرافت کھو دیں گے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اخلاق بر بنائے اصول نہیں ہوتا بلکہ بر بنائے ذات ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اخلاقی اصولوں کے ماتحت نہیں کرتے بلکہ خود اخلاق کو اپنا ماتحت سمجھتے ہیں۔ ذاتی تقاضے اور اخلاق میں ٹکراؤ نہ ہو تو وہ اخلاق برتیں گے۔ اور جب ذاتی تقاضے اور اخلاق میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو وہ اخلاق و شرافت کو بھی خیر باد کہہ دیں گے۔

سچا انسان وہ ہے جو با اصول انسان ہو۔ جو اصول کو اپنی زندگی میں سپریم حیثیت دیے ہوئے ہو، جو ہر حال میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کرے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ اخلاق کو اخلاق کے لیے اختیار کرے نہ کہ مفاد کے لیے۔ وہ جس طرح اپنے دوست کے لیے با اخلاق ہوتا ہے اسی طرح وہ اپنے دشمن کے لیے بھی با اخلاق ہو۔ وہ اپنی تنقید کرنے والے کو بھی اسی طرح خوش اخلاقی کا تحفہ دے جس طرح وہ اپنی تعریف کرنے والے کو خوش اخلاقی کا تحفہ دیتا ہے۔

جو لوگ اخلاق کو مستقل اصول کے طور پر اختیار کریں وہی حقیقتہً با اخلاق ہیں۔ جن لوگوں کا اخلاق ان کے مفاد یا مزاج کے تابع ہو انھیں کبھی حسن اخلاق کا کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

سنت صبر

صبر کیا ہے، صبر یہ ہے کہ جذبات یا اشتعال کے موقع پر اپنے آپ کو تھاما جائے۔ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے جذبات کو روک کر یہ سوچا جائے کہ میرے لیے اس موقع پر صحیح ردعمل کیا ہے اور زیادہ نتیجہ خیز کارروائی کیا ہوسکتی ہے۔

کبھی جذبات کو روک لینے کا نام صبر ہے، کبھی صبر اس کا نام ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو جوابی اقدام سے باز رکھا جائے اور کبھی صبر یہ ہوتا ہے کہ اقدام تو کیا جائے مگر وہ منصوبہ بند اقدام ہو نہ کہ محض جذباتی اقدام۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک مخالف اگر کسی کو نقصان پہنچائے تو وہ اس پر صبر کرلے یا وہ اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرے۔

جواب یہ ہے کہ صبر کا مطلب خواہ مخواہ نقصان اٹھانا نہیں ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ غیر موافق صورت حال پیش آنے کے بعد ٹھنڈے ذہن سے آپ یہ سوچیں کہ آپ کا جوابی اقدام آپ کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا یا آپ کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گا۔ صبر کا مطلب اپنے آپ کو مزید نقصان سے بچانا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا۔

صبر کبھی عمل کا نام ہوتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو عمل سے روک لینے کا، یہ دراصل حالات ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ کس موقع پر کون سا صبر مطلوب ہے۔

صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی نتیجہ پر غور کیے بغیر حالات کے طوفان میں کود پڑتا ہے۔ اور صبر والا آدمی صورت حال پیش آجانے کے بعد پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہے، لوگوں سے مشورہ کرتا ہے، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت وہ کارروائی کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہوسکے۔

صبر حکمتِ عملی کا نام ہے اور بے صبری یہ ہے کہ آدمی وقتی کیفیت سے متاثر ہوکر ایسا اقدام کر بیٹھے جس کا حکمت اور دوراندیشی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ناقابلِ تسخیر طاقت

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بار بار نشیب و فراز کے واقعات پیش آئے ہیں مگر یہ تمام واقعات سماجی اور اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں تک دعوت کا مسئلہ ہے، اس اعتبار سے اسلام مسلسل تاریخ میں مارچ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دعوت کے پہلو سے اسلام کبھی زوال کا شکار نہیں ہوا۔ اسلام کا دعوتی پہلو اس حد تک ناقابلِ شکست ہے کہ وہ اس وقت بھی جاری رہتا ہے جب کہ مسلمان اپنے ضعف کی بنا پر موثر دعوتی عمل کو جاری کرنے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔

اس کی ایک واضح تاریخی مثال تاتاریوں کا مسئلہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ترکستان (روس) اور منگولیا (چین) کے علاقے میں کچھ قبائل آباد تھے جن کو ترک کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک سردار چنگیز خان (۱۲۲۷-۱۱۶۲) تھا۔ یہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا۔ وہ ۲۰ ہزار جنگ جو افراد کو جمع کر کے اپنے علاقہ سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا چین سے ایران تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد یہ قبائل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہلاکو خان (۱۲۶۵-۱۲۱۷) اٹھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کو برباد کرنے کے بارے میں اپنے دادا (چنگیز خان) کے منصوبہ کو مکمل کیا۔ اس نے دار السلطنت بغداد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور خلیفہ معتصم باللہ کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ تاتاری سرداروں کو مسلم حکمراں (خوارزم شاہ) سے کچھ شکایت پہنچی تھی، اس بنا پر وہ غضب ناک ہو گئے اور مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے درپے ہو گئے۔

یہ اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ خوف ناک واقعہ تھا۔ تاتاریوں کے ظلم و فساد کی بنا پر اسلامی دنیا میں ان کا اتنا زیادہ ہول طاری ہوا کہ کہا جانے لگا: اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو یقین مت کرنا)

اس کے بعد صرف ۵۰ سال کے اندر تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ ناقابل قیاس طور پر یہ معجزہ پیش آتا ہے کہ یہی ترک (تاتاری) جو اسلام کے کٹر دشمن تھے وہ اس کے دوست اور خادم بن گئے۔ ان کی بیشتر تعداد نے بہت تھوڑی مدت میں اسلام قبول کر لیا۔ اس

کے بعد وہ مکمل طور پر ایک بدلی ہوئی قوم بن گئے۔ انھوں نے مسلم دنیا کو دوبارہ آباد کیا۔ سمرقند سے لے کر حلب تک جن مسجدوں کو انھوں نے ڈھا دیا تھا ان کی دوبارہ تعمیر کر کے ان کے اندر خدائے واحد کے لیے سجدہ کیا۔ اس کے بعد تقریباً ۶۰۰ سال تک وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بنے رہے۔

یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اس کی صورت یہ ہوئی کہ فاتح تاتاریوں نے بہت بڑی تعداد میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو گرفتار کیا اور ان کو اپنے گھروں میں خادم اور خادمہ بنا کر رکھ لیا، اس طرح ان کا اختلاط ہر وقت مسلمان مردوں اور عورتوں سے ہونے لگا۔ وہ بار بار دیکھتے تھے کہ مسلمان مرد یا عورت کوئی ایسا عمل کر رہے ہیں جو ان کی مانوسات کے خلاف ہے۔ مثلاً ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا۔ کوئی کام شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا۔ مختلف مواقع پر الحمدللہ اور جزاک اللہ کہنا۔ اسی طرح نماز اور دوسری عبادات وغیرہ۔ ان میں سے ہر چیز تاتاریوں کو اپنے معلوم اور مانوس طریقہ سے مختلف دکھائی دیتی تھی۔ وہ ان پر سوالات کرتے تھے۔ اس طرح گفتگوؤں کے دوران اسلام کی تعلیمات ان پر واضح ہونے لگیں۔

اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ تاتاری جب بازاروں میں نکلتے، شکار یا اور کسی کام سے باہر جاتے تو بار بار ان کا سابقہ کسی مسلمان سے پڑتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں بھی بار بار اسلام زیر بحث آنے لگا۔ اس طرح کسی تبلیغی منصوبہ کے بغیر دعوتی عمل تاتاریوں کے درمیان مکمل طور پر جاری ہو گیا۔

اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اولاً ان کے حکمرانوں اور سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد عام تاتاریوں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھایا تھا وہی دوبارہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے والے بن گئے۔

اسلام ایک ناقابلِ تسخیر طاقت ہے۔ اسلام صرف اپنوں کو متاثر نہیں کرتا بلکہ غیروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ حتی کہ ان لوگوں کو بھی جو کسی وجہ سے بظاہر اس کے دشمن بن گئے ہوں۔

جنگ اسلام میں

بعض "مفکرین اسلام" کا کہنا ہے کہ اسلام میں جنگ کی دو قسمیں ہیں ——— مصلحانہ جنگ اور مدافعانہ جنگ۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اس نظریہ کے لئے قرآن اور حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں صرف ایک جنگ ہے اور وہ مدافعانہ جنگ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، مصلحانہ تحریک ہوتی ہے، مصلحانہ جنگ نہیں ہوتی۔ مصلحانہ جنگ قرآن و سنت کے پورے ذخیرے میں ایک اجنبی چیز ہے۔ اس کا ماخذ شاعروں اور خطیبوں اور انشا پردازوں کی طبع آزمائیاں ہیں نہ کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

مشہور حدیث کے مطابق ہر قسم کی اصلاح کا مدار قلب پر ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ جس طرح جسمانی نظام میں قلب کی اصلاح سے پورے جسم کی اصلاح ہوتی ہے، وہی معاملہ دینی نظام کا بھی ہے۔ انسان کو اصلاح یافتہ بنانے کی صورت یہ ہے کہ قلب یا ذہن کی سطح پر اس کے اندر اصلاح لائی جائے۔

اس حدیث کے مطابق مصلحانہ تحریک (نہ کہ مصلحانہ جنگ) کا اصول یہ ہے کہ ساری طاقت انسان کے فکر و شعور کو بدلنے پر صرف کی جائے ——— دلائل کے ذریعہ آدمی کی سوچ کو بدلنا۔ جنت اور جہنم کی باتوں کے ذریعہ اس کے قلب میں نرمی پیدا کرنا، خدا کی نشانیوں کی یاد دہانی کے ذریعہ اس کی ربانی فطرت کو جگانا۔ یہ ہے انسانی اصلاح کا طریقہ۔ اس کو دوسرے لفظوں میں مصلحانہ تحریک بھی کہا جا سکتا ہے۔

جنگ کا مقصد ہمیشہ کسی خارجی رکاوٹ کو دور کرنا ہوتا ہے نہ کہ انسان کے اندر باطنی کیفیت پیدا کرنا۔ باطنی کیفیت یا باطنی شعور کا ذریعہ صرف وعظ و تلقین ہے، اس کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم ہے اور وہ دفاع (Defence) ہے۔ اگر کوئی گروہ اہل اسلام کے خلاف جارحیت کرے تو حسب استطاعت اس سے مقابلہ کیا جائے گا خواہ یہ مقابلہ کھلی جنگ کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ عام حالات میں اسلام کا طریقہ پر امن دعوت کا طریقہ

ہے ۔ اور جارحیت کی صورت میں مسلّح مقابلہ کا طریقہ ۔

ایک مطالعہ

صلح حدیبیہ (٦ ھ) کے بعد جب حالات معتدل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے باہر مختلف علاقوں میں تبلیغی دستے روانہ فرمائے ۔ انھیں میں سے ایک تبلیغی دستہ وہ تھا جو مدینہ کے شمال میں شام کی سرحد سے ملے ہوئے علاقہ کی طرف بھیجا گیا ۔ یہاں عیسائی قبائل آباد تھے اور وہ رومی (بازنطینی) حکومت کے ماتحت تھے ۔

اس تبلیغی وفد میں پندرہ آدمی تھے اور ان کے سردار کعب بن عمیر الغفاری تھے ۔ وہ شام کے قریب ذات اطلاح میں پہنچے ۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر کافی لوگ جمع ہیں ۔ انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی ۔ مگر انھوں نے ان کی پکار پر لبیک نہیں کہا ۔ بلکہ ان پر تیر برسانے لگے (فدعوھم الی الاسلام فلم یستجیبوا لھم ورشقوھم بالنبل) البدایۃ والنہایۃ ۴ / ۲۴۱

اس یک طرفہ حملہ میں بارہ مسلمان شہید ہو گئے ۔ صرف کعب بن عمیر الغفاری زخمی حالت میں مدینہ واپس آئے ۔ شامی سرحد پر بسنے والے ان عیسائیوں کا حملہ ، بالواسطہ طور پر رومی سلطنت کا حملہ تھا ۔ اس طرح رومی سلطنت نے سب سے پہلے اسلام کے خلاف اپنی جارحیت کا آغاز کیا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحارث بن عمیر الازدی کو ایک دعوتی مکتوب لے کر حاکم بصرہ کی طرف روانہ کیا ۔ جب وہ موتہ (شام) میں پہنچے تو ان کی ملاقات شرحبیل ابن عمرو الغسانی سے ہوئی ۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو ۔ انھوں نے کہا کہ حاکم بصرہ کے پاس ۔ اس نے کہا ، شاید تم محمد کے فرستادہ ہو ۔ انھوں نے کہا ہاں ۔ اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور انھوں نے الحارث بن عمیرؓ کو تلوار مار کر قتل کر دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ قتل حاکم بصری کے اشارہ پر کیا تھا (الرسول فی المدینۃ ۲۲۹)

شرحبیل بن عمرو الغسانی عیسائی تھا اور وہ رومی حکومت کا ایک افسر تھا ۔ اس کا یہ فعل بین اقوامی روایت کے مطابق ، اقدام جنگ کے ہم معنی تھا ۔ اس لئے آپ نے تین ہزار افراد کا ایک لشکر تیار کیا اور جمادی الاولیٰ ۸ھ میں اس کو موتہ (شام) کی طرف روانہ فرمایا ۔

شرحبیل کو جب مسلم لشکر کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے جمع کیا۔ اسی کے ساتھ خود شاہ روم ہرقل ایک لاکھ فوج لے کر شرحبیل کی مدد کے لئے بلقاء کے مقام پر پہنچا۔ تین ہزار اور دو لاکھ کا تناسب بہت زیادہ غیر مساوی تھا۔ یہ مقابلہ فیصلہ کن نہ بن سکا، تاہم مسلمانوں نے اتنی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا کہ رومیوں کے اوپر مسلمانوں کی فوجی صلاحیت کا رعب قائم ہو گیا۔

مستشرق واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) نے پیغمبر اسلام کی زندگی پر ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس کا اقتباس دکتور علی حسنی الخربوطلی نے اپنی کتاب "الرسول فی المدینہ" میں نقل کیا ہے۔ واشنگٹن ارونگ نے لکھا ہے کہ عرب میں اسلام کی اشاعت سے جب عرب کے بکھرے ہوئے قبائل متحد ہو گئے تو شہنشاہ ہرقل کو یہ عرب اتحاد اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے طے کیا کہ ایک بڑا لشکر تیار کرے اور اپنے اس "امکانی دشمن" پر حملہ کر کے اس کو کچل ڈالے۔ چنانچہ اس نے عرب کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دیا۔ (صفحہ ۲۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اطراف کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہرقل نے سرحد عرب پر فوجیں جمع کی ہیں تاکہ عرب پر حملہ کر کے اسلام کا زور توڑ دے تو آپ نے فوراً جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ مہم پیش آئی جس کو غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے۔

آپ نے مسلسل وعظ و تلقین کے ذریعہ مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس مہم کے لئے نکلیں۔ چنانچہ سخت حالات کے باوجود ۳۰ ہزار آدمیوں کا لشکر اس مہم کے لئے تیار ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کا ایک جزء یہ ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلّ ما یخرج فی غزوۃ الا کنی عنہا الا ما کان من غزوۃ تبوک فانہ بینہا للناس ... فامرہم بالجہاد و اخبرہم انہ یرید الروم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کے لئے نکلتے تو زیادہ تر آپ اشارہ اور کنایہ سے کام لیتے تھے۔ مگر غزوۂ تبوک میں آپ نے اس سے مختلف طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی بابت آپ نے صاف طور پر لوگوں کے سامنے اعلان کیا۔ آپ نے انھیں جہاد کا حکم

(البدایۃ والنھایۃ ۵/۳) دیا اور ان کو اس بات کی خبر دی کہ آپ کا قصد روم کی طرف ہے۔

غزوۂ تبوک اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے بارہ میں بہت سی تفصیلات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس واقعہ کا مطالعہ کیجئے تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق جنگ کے بارہ میں نہایت اہم اصول سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے دو اصول یہ ہیں :

۱۔ ایک یہ کہ تبوک کی مہم کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فوجی اقدام بطور دفاع تھا۔ وہ جارحانہ اقدام کے طور پر نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ہے۔ اسلام میں جنگی اقدام صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ بطور دفاع ایسا اقدام کرنا ضروری ہو گیا ہو۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ دفاعی اقدام میں بھی ٹکراؤ لازمی طور پر ضروری نہیں ہے۔ اگر اس کا امکان ہو کہ طاقت کے مظاہرہ سے یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ دشمن پیچھے ہٹ جائے اور اپنے جارحانہ ارادہ سے باز آجائے تو اپنے اقدام کو "مظاہرہ" کی حد میں رکھا جائے گا، اس کو لازماً جنگی ٹکراؤ تک نہیں لے جایا جائے گا۔

یہی مصلحت تھی جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عام عادت کے خلاف غزوۂ تبوک کی تیاری پورے اعلان و اظہار کے ساتھ کی۔ اور روانگی میں بھی اخفاء کے بجائے اظہار کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے سرحد شام پہنچنے سے پہلے رومیوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ پیغمبرِ اسلام ۳۰ ہزار جاں بازوں کے ساتھ تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس مظاہرہ کا متوقع فائدہ حاصل ہوا۔ رومی حکمراں نے مرعوب ہو کر اپنی فوجوں کو پیچھے لوٹنے کا حکم دے دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومی فوجوں کی پسپائی کا علم ہوا تو آپ بھی مزید اقدام سے رک گئے (الرسول فی المدینہ، صفحہ ۲۳۴)

اسلام کی عام پالیسی یہی ہے کہ حتی الامکان جنگ سے اعراض کیا جائے۔ یہ پالیسی اسلام کے اصل مقصد و مدعا کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ اسلام کا مقصد لوگوں کو جہنم کے راستہ سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر ڈالنا ہے نہ یہ کہ وہ جاہلیت کی جس زندگی میں ہیں، وہیں مار کر انھیں ختم کر دیا جائے۔

ایک تاجر کی نگاہ آدمی کی جیب پر ہوتی ہے۔ ایک جنگ باز کی نگاہ آدمی کی گردن پر۔ اس

کے برعکس اسلام کی نگاہ آدمی کے دل پر ہوتی ہے۔ اسلام کا مقصد لوگوں کے دلوں کو بدلنا ہے تاکہ وہ اپنے رب کی رحمتوں میں حصہ پاسکیں۔

کوئی شخص خواہ دشمن ہو یا غیر مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ان سب سے پہلے وہ انسان ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم سی "انسان" تک پہنچیں اور اس کے دل کے دروازہ پر دستک دیں۔ کیا عجب کہ اس کی فطری صلاحیت جاگ اٹھے اور وہ دین حق کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔

اس کی مثال خود رومیوں کے قصہ میں موجود ہے۔ عین اس زمانہ میں جب کہ رومیوں سے کشمکش چل رہی تھی، اسی زمانہ میں رومیوں کی اعلیٰ صف کے ایک آدمی نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ فرَوَۃ بن عَمْرو الجذامی (م ۱۲) تھے۔ وہ ایک عیسائی تھے اور بنو النافرۃ کے اوپر رومیوں کی طرف سے حاکم تھے۔ بنو النافرۃ کے لوگ خلیج عقبہ اور ینبع کے درمیان رہتے تھے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا اور اس کی خبریں عرب میں پھیلیں تو فروۃ اس سے متاثر ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

فروۃ الجذامی نے اپنے قبول اسلام کی اطلاع ایک قاصد کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی۔ اور ہدیہ کے طور پہ ایک سفید خچر بھی آپ کے لئے روانہ کیا۔ رومی حکمراں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فروہ کو اپنے پاس بلاکر انھیں قید میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ فروہ کو فلسطین میں عفراء نامی ایک چشمہ کے پاس لے گئے اور تلوار مار کر انھیں قتل کر دیا۔ رومی جب فروہ کو قتل کے مقام پر لائے تو فروہ نے یہ شعر کہا:

بَلِّغْ سَرَاةَ الْمُسْلِمِينَ بِأَنَّنِي سِلْمٌ لِرَبِّي أَعْظُمِي وَمَقَامِي

مسلمانوں کے سردار کو یہ خبر پہنچا دو کہ میری ہڈیاں اور میرا پورا وجود میرے رب کے لئے ہے (سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۶۲)

فروۃ بن عمرو اگرچہ قتل کر دئے گئے، مگر ایک اصول پر قائم رہنے کی بنا پر قتل کیا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ ایسا آدمی اپنے پورے وجود سے اس اصول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے جس کی خاطر اس نے اپنی جان دی ہے۔ جہاں لوگوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو بازار کی سیاہی سے لکھ رکھا ہے، وہاں وہ اپنے نظریہ کی صداقت کو اپنے خون کی سرخی سے تحریر کرتا ہے۔ ایسی موت ہزاروں لوگوں کے لئے زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دور اول کے مسلمانوں کی اس قسم کی قربانیوں نے ایک عیسائی علاقہ کو ابدی طور پر ایک مسلم علاقہ بنا دیا۔

موافق میدان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ وہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال کا واقعہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ رسول کا خواب وحی ہوتا ہے۔ چنانچہ ذوالقعدہ ۶ھ کے آغاز میں آپ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ آپ کے علاوہ چودہ سو اصحاب بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ عمرہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھ قربانی کے ستر اونٹ بھی تھے جن کی گردنوں میں ہدی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کے پاس صرف ایک تلوار میان میں تھی جو قدیم قبائلی دور میں ہر مسافر کا معمول سمجھی جاتی تھی۔ ذوالحُلیفہ (موجودہ بئر علی) کے مقام پر پہنچ کر پورے قافلہ نے حسب قاعدہ احرام باندھ لیا اور لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کی پکار کے ساتھ مکہ (بیت اللہ) کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ ایک حرام مہینہ تھا۔ تمام ظاہری علامات کے مطابق یہ عمرہ ادا کرنے والوں کا قافلہ تھا۔ عرب کی پوری تاریخ میں ایسے کسی قافلہ کو کبھی روکا نہیں گیا تھا۔ مگر قریش (اہل مکہ) نے اس وقت مسلمانوں کے خلاف جنگ اور عداوت کی جو مہم چلا رکھی تھی اس نے اس سادہ سے واقعہ میں سیاسی اور قومی پہلو پیدا کر دیا۔ قریش نے اس کو اپنی غیرت وحمیت کے خلاف سمجھا کہ ان کے دشمنوں کا قافلہ بغیر کسی رکاوٹ کے مکہ میں داخل ہو اور عمرہ کر کے شان کے ساتھ واپس چلا جائے۔

چنانچہ قریش نے آپ کو روکنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے خالد بن ولید کی سرداری میں ۲۰۰ سواروں کا دستہ روانہ ہوا اور مکہ سے چل کر ذی طُوٰی کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے راستہ میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عُسفان کے مقام پر پہنچے تھے کہ آپ کے مخبر نے یہ اطلاع دی۔ آپ نے خالد کی مڈبھیڑ سے بچنے کے لئے فوراً اپنا راستہ بدل دیا۔ سیدھے اور عام راستہ سے چلنے کے بجائے آپ پہاڑی راستہ سے گھوم کر آگے نکل گئے اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ تاہم قریش نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ آپ کا ایک آدمی جو ایک

پہاڑی پر چڑھ کر حالات کا مشاہدہ کر رہا تھا اس کو تیر مار کر ھلاک کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار جب کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے، قریش کے تقریباً پچاس آدمی آئے اور پتھر برسانا شروع کر دیا۔ اسی طرح ایک بار قریش کے کچھ لوگ رات کے وقت آئے اور اچانک آپ کے خیموں پر حملہ کر دیا۔ وغیرہ

اس قسم کے واقعات ہوتے رہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ آپ صرف یہ کہتے رہے کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ حتیٰ آپ نے حضرت عثمان کو اپنا نمائندہ بنا کر مکہ والوں کے پاس بھیجا کہ وہ سرداران قریش سے کہیں کہ زیارت کعبہ کے سوا ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ ہم طواف اور قربانی کے بعد مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ مگر قریش نے اپنی ضد میں حضرت عثمان کو روک لیا۔ یہاں تک کہ غلط طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان قتل کر دئے گئے۔ اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا کہ فوراً مکہ پر چڑھائی کر دیں۔ بلکہ قریش کے سامنے اظہار عزیمت کے لئے صرف جہاد کی بیعت لی اور بدستور حدیبیہ میں مقیم رہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس پر بیعت لی تھی کہ اگر مقابلہ کی نوبت آئی تو ہم نہیں بھاگیں گے (بایعنا علیٰ ان لا نفر، سیرت ابن ہشام، جلد ۳، صفحہ ۳۶۴)

اس درمیان میں مکہ کے کچھ امن پسند لوگوں نے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ مثلاً بنو خزاعہ کا سردار بُدیل بن ورقاء، احابیش کا سردار حُلیس بن علقمہ، بنو ثقیف کا سردار عروہ بن مسعود ثقفی، وغیرہ۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا حال دیکھنے کے بعد مکہ جا کر قریش کو بتایا کہ یہ لوگ صرف زیارت کعبہ کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ عمرہ کے ارکان ادا کرنے کے بعد خود ہی واپس چلے جائیں گے۔

کعبہ کی زیارت سے کسی کو روکنا عرب روایات کے سراسر خلاف تھا۔ اس لئے ضد اور عداوت کے باوجود قریش کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے اشتعال کے باوجود خاموش رہے۔ آپ کے اس پر امن رویہ نے مزید یہ کیا کہ قریش سے ہر قسم کی جارحیت کا جواز چھین لیا۔ بالآخر اپنی بالاتری قائم رکھنے کی خاطر انھوں نے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو اس پر راضی کریں کہ وہ اس سال مدینہ واپس چلے

جائیں اور اگلے سال مکہ آکر عمرہ ادا کریں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے سہیل بن عمرو کی قیادت میں اپنا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سہیل" کو دیکھا تو اس سے اچھا فال لیا اور فرمایا کہ اب معاملہ سہل ہوگیا (قد سھل لکم من امرکم) آپ نے کہا کہ اس آدمی کو بات چیت کے لئے بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریش نے اب صلح کا ارادہ کر لیا ہے (قد ارادَ القومُ الصلحَ حین بعثُوا ھذا الرجلَ)

جب صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو سہیل بن عمرو نے بے حد ضد کا مظاہرہ کیا۔ تاھم آپ اس کی ہر ضد کو مانتے چلے گئے اور تقریباً ایک طرفہ طور پر قریش سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی تفصیلی دفعات سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

معاہدہ کی بات چیت کے دوران قریش نے بار بار ضد اور عداوت کا مظاہرہ کیا۔ مگر آپ جوابی انداز اختیار کرنے کے بجائے ان کی ہر بات مانتے رہے اور اس کو نظر انداز کرتے چلے گئے۔

ابتداءً یہ تجویز پیش ہوئی کہ ایک فریق کا کوئی آدمی دوسرے فریق کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو فریق اول کی طرف واپس کر دے۔ سہیل نے کہا کہ ہمارا آدمی آپ کے پاس آئے تو آپ کو اسے واپس کرنا ہوگا۔ مگر آپ کا آدمی ہمارے پاس ہو تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یک طرفہ شرط کو منظور کر لیا۔

معاہدہ کی کتابت حضرت علی کر رہے تھے۔ آپ نے مضمون املاء کراتے ہوئے فرمایا: لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سہیل بن عمرو نے کہا نہیں۔ بلکہ ہمارے طریقہ کے مطابق یوں لکھو باسمك اللّٰھمّ ۔ مسلمانوں نے یہ سن کر کہا خدا کی قسم، ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا اور کچھ نہ لکھیں گے (واللہ لا نکتبھا إلّا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بحث نہیں کی بلکہ وہی الفاظ لکھوا دئے جو سہیل بن عمرو اور اس کے ساتھی چاہتے تھے۔

اس کے بعد آپ نے اگلا جملہ ارشاد فرمایا: ھٰذا ما قضیٰ علیہ محمد رسول اللہ (یہ وہ ہے جس کا فیصلہ محمد اللہ کے رسول نے کیا) سہیل نے دوبارہ کہا: خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ آپ سے جنگ کرتے۔ بلکہ یوں لکھئے

کہ "محمد بن عبد اللہ"۔ آپ نے حضرت علی سمیت تمام صحابہ کی ناگواری کے باوجود حکم دیا کہ محمد رسول اللہ کاٹ دو اور محمد بن عبد اللہ لکھو۔ (واللہ انی لرسول اللہ وان کذبتمونی۔ اکتب محمد بن عبد اللہ)

معاہدہ کی دفعات طے ہونے کے بعد اس کی کتابت جاری تھی کہ ابو جندل بن سہیل بن عمرو آ گئے۔ وہ مسلمان ہو چکے تھے مگر مکہ والوں نے ان کو بیڑیوں میں باندھ رکھا تھا۔ انھوں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کے قریب حدیبیہ میں موجود ہیں تو وہ کسی طرح بھاگ کر یہاں پہنچے۔ ان کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں تھیں اور جسم پر مار پیٹ کا نشان تھا۔ انھوں نے چلّا کر کہا کہ مجھے اس ظالمانہ قید سے بچائیے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ نہیں۔ یہ معاہدہ کے ایفاء کا پہلا موقع ہے اور آپ پر لازم ہے کہ ابو جندل کو ہمارے حوالے کریں۔ ابو جندل نے چلّا کر کہا کہ کیا میں ظالم کافروں کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا حالاں کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ تمام صحابہ بگڑ گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندل کو صبر کی تلقین کر کے انھیں واپس کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ کر کے واپس روانہ ہوئے۔ آپ کُراع الغمیم کے مقام پر پہنچے تھے کہ فرشتہ خدا کی طرف سے سورہ فتح لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ اس کو پا کر آپ اتنا مسرور ہوئے کہ آپ نے فرمایا: آج مجھ پر ایسی سورہ نازل ہوئی ہے جو مجھ کو دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے (نزل علیّ البارحۃ سورۃ ھی اَحبُّ الیَّ من الدنیا ومافیھا) اس سورہ کی ابتدائی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

بے شک ہم نے تم کو فتح مبین دے دی" تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔ اور تم کو صراط مستقیم دکھائے۔ اور تم کو زبردست نصرت عطا کرے۔ وہی ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکینت اتاری تاکہ ان کے ایمان میں ایک اور ایمان کا اضافہ ہو۔ اور زمین و آسمان کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ تاکہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اور اللہ کے نزدیک یہی بڑی

کامیابی ہے۔ اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے باب میں برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کی گردش انھیں پر ہے۔ اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور اس نے ان کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے (الفتح ۱-۶)

" اور خدا تم کو صراط مستقیم دکھائے۔" اس آیت کا تعلق واضح طور پر اسی صلح کے واقعہ سے ہے۔ یہاں نہ عقائد کا ذکر ہے اور نہ عبادات کا۔ بلکہ تمام تر ذکر صرف صلح حدیبیہ کا ہے۔ اس لئے اس سیاق میں اس کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ اس لئے پیش آیا تاکہ اجتماعی مقابلہ میں حریف کے اوپر فتح پانے کی صراط مستقیم تمہیں بتائی جائے۔ موجودہ دنیا میں جب اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ہو تو اس میں حقیقی فتح پانے کا خدائی راستہ صرف وہ ہے جو صلح حدیبیہ کی مثال کی صورت میں ہمارے اوپر کھولا گیا ہے۔

اس آیت میں اتمام نعمت سے مراد حق کے ساتھ غلبہ کو جمع کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق اپنی کامل صورت میں پہلے بھی ملا ہوا تھا۔ البتہ اس حق کے ساتھ دنیوی غلبہ ابھی تک جمع نہیں ہوا تھا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ملک میں غلبہ کا راستہ کھول دیا۔

" اور تاکہ خدا تم کو زبردست نصرت عطا کرے۔" یہ آیت موجودہ دنیا میں خدا کے قانون نصرت کو بتاتی ہے۔ اہل ایمان اگر چاہتے ہیں کہ خدا کی مدد ان کا ساتھ دے تو اس کا مستحق بننے کے لئے انھیں اس صلاحیت کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ اس کام میں اپنی محنتیں صرف کریں جو صلح اور امن کے حالات میں انجام دیا جاتا ہے نہ کہ وہ کام جو جنگ کے حالات میں انجام دیا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگی حالت قائم تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمانوں کے سامنے یہ نشانہ تھا کہ وہ غیر مسلموں کی گردن کاٹیں۔ صلح کے بعد نشانہ بدل گیا۔ اب ان کا کام یہ قرار پایا کہ وہ غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کا پیغام داخل کریں۔ گویا خدا کی نصرت کا مستحق بننے کا راز غیر مسلموں کو اپنا حریف بنانا نہیں ہے بلکہ اس کا راز یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا مدعو بنایا جائے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کے دلوں پر جو سکینت نازل ہوئی وہ کیا تھی۔ وہ یہ تھی کہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ متعلقہ معاملہ میں ردعمل کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ ردعمل کی نفسیات سے بلند ہوکر مثبت رویہ کا ثبوت دیں۔ انھوں نے اشتعال کے موقع پر بے اشتعالی کا طریقہ اختیار کیا۔ فریق ثانی

کی طرف سے ضد کا مظاہرہ ہو اگر انھوں نے ضد کو چھوڑ کر یک طرفہ شرائط پر ان سے صلح کر لی۔

" ایمان پر ایمان کا اضافہ" سے مراد یہ ہے کہ اب تک وہ معمول کے حالات میں ایمان والے بنے ہوئے تھے، اب انھوں نے غیر معمولی حالات میں صاحب ایمان ہونے کا ثبوت دیا۔ جس خدا کو وہ پہلے جذبات کے ٹھہراؤ کی حالت میں مانے ہوئے تھے اس خدا کو اب انھوں نے جذبات کے ہیجان کی حالت میں مانا۔ جس خدا کے حکم کی تعمیل مزاج کی موافقت کے ساتھ کر رہے تھے، اس خدا کے حکم کی تعمیل انھوں نے مزاج کی مخالفت کے باوجود کی۔ جس خدا کے نام پر انھوں نے اپنا سر اونچا کیا تھا، اسی خدا کے حکم سے انھوں نے اب اپنا سر نیچا کر لیا۔

" زمین و آسمان کا تمام لشکر اللہ کا ہے۔" یہ بات اس موقع پر کیوں کہی گئی۔ جواب یہ ہے کہ خدا کی ایک سنت کو بتانے کے لئے۔ اس کائنات میں ہر قسم کی طاقت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ رسول اور اصحاب رسول کو فرشتوں کی فوج کے ذریعہ معجزاتی طور پر غالب کر سکتا تھا۔ مگر یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں کے لئے خدا کا یہ قانون نہیں۔ موجودہ دنیا میں ہر ایک کو آزادی ہے۔ اس لئے یہاں تمام واقعات اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنے رسول کو" ذلت آمیز صلح" پر راضی ہو جانے کا حکم اس لئے دیا، کیوں کہ موجودہ عالم اسباب میں باعزت فتح کی منزل تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے۔

متفقہ روایات کے مطابق سورہ فتح حدیبیہ سے لوٹتے ہوئے ذی قعدہ ۶ھ میں نازل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں دشمن سے صلح کر لینے کو فتح مبین کہا گیا ہے۔ اس صلح کی تاریخ اور اس کی دفعات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا خلاصہ یہ تھا کہ دشمن کی تمام شرائط کو مان کر اس سے یہ عہد لے لیا جائے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے دس سال تک جنگ نہ ہوگی۔ گویا اس سورہ میں جس چیز کو فتح مبین کہا گیا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تھا کہ دشمن کو میدان جنگ سے ہٹا کر میدان امن میں لایا جائے۔

اس معاہدہ کا فریق اول (مسلمان) محض عام قسم کا ایک گروہ نہ تھا بلکہ وہ ایک داعی گروہ تھا۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی صداقت تھی۔ ایسی صداقت جو عقل اور فطرت کو مسخر کر لینے والی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو اس معاہدہ کے معنی اس وقت یہ تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے

درمیان میدان مقابلہ کو بدل دیا جائے۔ وہ مقابلہ جواب تک جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا اس کو وہاں سے ہٹا کر دعوت کے میدان میں لایا جائے۔

بعثت نبوی سے لے کر صلح حدیبیہ تک تقریباً ۲۰ سال کی مدت ہے۔ اس طویل مدت میں اتنے لوگ مسلمان نہ ہوئے تھے جتنا صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں ہوئے۔ حدیبیہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف چودہ سو مسلمان تھے۔ جب کہ حدیبیہ کے بعد دو سال سے بھی کم مدت میں آپ نے مکہ کی طرف مارچ کیا تو آپ کے ساتھ دس ہزار مسلمان شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہجرت کے بعد مسلسل جنگوں کی وجہ سے اشاعت اسلام کا کام ٹھپ پڑ گیا تھا۔ دس سالہ ناجنگ معاہدہ کے بعد جب فضا معتدل ہوئی تو اشاعت اسلام کا کام پوری تیزی سے ہونے لگا۔ گویا کہ جنگی صورت حال کی بنا پر اسلام کا زیادہ طاقت ور ہتھیار غیر استعمال شدہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ نے اس طاقت ور ہتھیار کو قابل استعمال بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

حدیبیہ کا معاملہ فتح مبین اس لئے تھا کہ اس نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ اسلام کے سب سے طاقت ور ہتھیار کو اس کے حق میں استعمال کیا جائے۔ حدیبیہ کی اسپرٹ یہ ہے کہ فریق ثانی کی ضد اور مخالفت کی وجہ سے اگر ٹکراؤ کی فضا پیدا ہو جائے تو یک طرفہ صبر کے ذریعہ ٹکراؤ کی فضا کو ختم کیا جائے تاکہ اسلامی دعوت کی راہ ہموار ہو سکے۔

فہمِ دین

۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو ۱۰ فلسطینی عرب ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ ان کے قائد شیخ کمال الخطیب تھے جو فلسطین کی اسلامک موومنٹ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ بقیہ نوجوان وہ تھے جو دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں زیر تعلیم فلسطینی نوجوانوں کا سالانہ مخیّم (کیمپ) بنگلور میں اسی سال دسمبر میں ہوا۔ یہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے ان میں سے ایک استاد جہاد محمد تھے وہ ریسرچ کے تحت دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 6846964

یہ سب نوجوان انتہا پسند فلسطینی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ تشدد کے ذریعہ فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجیے۔ میں نے کہا کہ نہ صرف فلسطین بلکہ کشمیر، الجزائر اور اس قسم کے دوسرے تمام مقامات کے لیے میری ایک ہی نصیحت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام لوگ تشدد کے طریقہ کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور صرف امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی تحریک چلائیں۔ وہ کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کو لے کر متشددانہ طریقہ نہ اختیار کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کو میرا یہ مشورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ : ما خُيّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا أخذ أيسرهما (فتح الباری ۶/۶۵۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملہ میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

میں نے کہا کہ آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ آزادیٔ وطن یا جہاد اسلام کے نام سے جو تحریک چلا رہے ہیں اس میں باعتبار اسلوب آپ کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ ایک، پُرتشدد طریقہ اور دوسرا پُرامن طریقہ۔ بروقت آپ لوگوں نے اپنی تحریک کے لیے پرتشدد طریقہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ مذکورہ روایت کے مطابق یہ سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ اختیار ایسر (اختیار اسھل) کے طریقہ کو اپنائیں۔ یعنی تشدد کے طریقہ کو

چھوڑ کر پر امن جدوجہد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کہا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ مَالَمْ یَکُنْ اِثْمًا (جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو)۔ اس وقت فلسطین اور دوسرے اس قسم کے مقامات پر حکمراں طبقہ لوگوں کو قتل کر رہا ہے اور ان کی اقتصادیات کو تباہ کر رہا ہے پھر اس سے بڑا اثم اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس اثم عظیم کی موجودگی میں کیسے اختیار ایسر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ خود حدیث کے الفاظ کے مطابق اس اثم کی موجودگی میں ہمیں امن کے سہل طریقہ کو چھوڑ کر تشدد کے مشکل طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ مالم یکن اثمًا کا یہ مطلب نہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ مالم یکن اثمًا، فان کان اثمًا کان ابعد الناس منه (جب تک کہ وہ اثم نہ ہو۔ اور اگر وہ اثم ہو تو آپ اس سے بہت زیادہ دور رہتے تھے) یہاں "وہ" سے مراد فریق ثانی کی روش نہیں ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ ہے۔ اس کا تعلق فعلِ غیر سے نہیں ہے بلکہ فعلِ رسولؐ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صورت حال کے مقابلہ کے لیے جب آپ کو دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہو تو آپؐ ہمیشہ آسان طریقہ کے ذریعہ سے فریق ثانی کا مقابلہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ بشرطیکہ اختیار کیا جانے والا یہ طریقہ اثم نہ ہو۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص کو پیاس لگی ہوئی ہے، اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس شراب کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے علم میں آتا ہے کہ اس علاقہ میں پانی کا ایک چشمہ ہے مگر وہ پہاڑ کے اوپر واقع ہے۔ اس مثال میں شراب پی کر اپنی پیاس بجھانا بظاہر آسان ہے اور چل کر پانی تک پہنچنا بظاہر مشکل۔ مگر یہاں شریعت کا حکم ہوگا کہ وہ آدمی آسان ہونے کے باوجود شراب سے اپنی پیاس نہ بجھائے بلکہ سفر کر کے چشمہ تک پہنچے اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔

ابن حجر العسقلانی نے حدیث کے مذکورہ حصہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

(ای مالم یکن الاسہل مقتضیًا للاثم فانه حینئذٍ یختار الاشد (فتح الباری ۶/۶۶۵) یعنی جب

تک آسان طریقہ کسی اثم کا مقتضی نہ ہو اور جب وہ طریقہ اثم کا مقتضی ہو تو آپؐ مشکل طریقہ کا انتخاب فرماتے۔
سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری عمر نبوت میں اس اصول کو اختیار فرمایا کہ جہاں آسان طریقہ اور مشکل طریقہ، دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ہو تو آپ نے ہمیشہ آسان کا انتخاب فرمایا۔
مثلاً مکہ میں بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب اس معاملہ میں آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک انتخاب تھا —— بیت اللہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ پر امن طور پر یہ تبلیغ کی جائے کہ اے لوگو، بت پرستی کو چھوڑو اور ایک خدا کی عبادت کرو۔ ان دونوں میں بت شکنی کا طریقہ واضح طور پر مشکل تھا اور پر امن تبلیغ کا طریقہ اس کے مقابلہ میں واضح طور پر آسان۔ چنانچہ آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کو لے لیا۔
اسی طرح ہجرت کے موقع پر آپ کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ مکہ والوں کے ظلم کے خلاف مسلح لڑائی چھیڑیں، اور دوسرے یہ کہ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموش طور پر مکہ سے مدینہ چلے جائیں۔ یہاں بھی آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا۔
غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مشرک قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں، آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ نوجوان مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی تیاری کی جائے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ ایران میں جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی ہے تو اپنے اور دشمنوں کے درمیان خندق کھود کر مسلح ٹکراؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو اختیار فرمایا جو دو ممکن صورتوں میں سے آسان صورت کے ہم معنی تھا۔
اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے تقریباً پندرہ سو اصحاب کو لے کر قریش سے مسلح ٹکراؤ کریں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ قریش سے صلح کر کے جنگ کو ٹال دیا جائے اور اپنی طاقت کو پر امن تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب لینے کے ہم معنی تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں۔ مذکورہ تمام افراد عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ مگر مذکورہ حدیث کو وہ نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان جاننے کے ساتھ آدمی کے اندر سنجیدگی ضروری ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (البقرہ ۲۸۲) اگر سنجیدگی نہ ہو تو صرف عربی زبان کو جاننا قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطابق، تقویٰ علم صحیح کا ذریعہ ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ) آدمی کے اندر اگر تقویٰ کی صفت نہ ہو تو خارجی معلومات کا کوئی بھی ذخیرہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تقویٰ عالم کے لیے ایک خدائی لگام کی مانند ہے۔ یہ لگام اس کو اِدھر اُدھر منحرف ہونے سے بچاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مفہوم اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے تحت مقرر کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ بظاہر ایک آیت یا ایک حدیث کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس آیت اور اس حدیث میں وہ خود اپنے آپ کو پڑھ رہے ہوں گے نہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی بات کو۔ ایسے لوگ اپنے جذبات وخیالات میں اتنا زیادہ گم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کو بے لاگ انداز میں سمجھ سکیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خالی الذھن ہو کر قرآن وحدیث کو پڑھے، وہ کھلے ذہن کے تحت یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خود آیت یا حدیث کے الفاظ سے کیا مفہوم نکل رہا ہے ایسے ہی لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں تقویٰ کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج بناتا ہے، خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کا ٹھیک وہی مفہوم لے جو واقعی طور پر اس سے نکلتا ہے نہ کہ کوئی خود ساختہ مفہوم جو آدمی کے اپنے دماغ میں تو ضرور ہے، مگر آیت کے الفاظ میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

بمبئی کا سفر

بھارتیہ ودیا بھون کے زیر انتظام بمبئی میں ۲۹۔۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع تھا: اقدار پر مبنی سماج۔ اس کی دعوت پر بمبئی کا سفر ہوا۔ یہاں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۶ جنوری کی شام کو دہلی ایرپورٹ پہنچا۔ یہاں بمبئی کے تین صاحبان مل گئے۔ یہ تینوں بمبئی کے مقامی لیڈر ہیں۔ اپنے قول کے مطابق، آئندہ الکشن کے مسئلہ پر راجیہ دھانی کے "مسلم لیڈروں" سے بات کرنے کے لیے وہ دہلی آئے تھے اور اب یہاں سے واپس جارہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کی انتخابی پالیسی کے بارہ میں آپ لوگوں نے کیا طے کیا۔ انھوں نے کسی قدر جوش کے انداز میں کہا: ہمیں نان کانگرس اور نان ہندتو پارٹیوں کا ساتھ دینا ہے۔ ہمیں مسلم دشمن طاقتوں کو ہرانا ہے، یہ ہماری انا کا سوال ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تھرڈ فورس (third force) کو ووٹ دیں گے جس کے افراد آج کل آپ کی دل پسند باتیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پرجوش طور پر جواب دیا: ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ میں نے کہا کہ نام نہاد تھرڈ فورس تو نو فورس ہے۔ اس کا ساتھ دے کر آپ صرف اپنے ووٹ کو ضائع کریں گے۔ آپ کی اس نگیٹو ووٹنگ کا فائدہ براہ راست انھیں لوگوں کو ملے گا جن کو آپ مسلم دشمن کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذکورہ انتخابی پالیسی سراسر ناکام رہی۔ ریاستی الکشن فروری ۱۹۹۵ میں نام نہاد تیسرے محاذ (تھرڈ فرنٹ) کے نمائندے بری طرح ہار ہو گئے۔ اور انتخابات کے بعد بھاجپا اور شیوسینا نے مل کر مہاراشٹر میں اپنی حکومت بنائی۔ یعنی انھیں لوگوں نے جن کو مسلمان اس الکشن میں ہرانا چاہتے تھے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے لوک سبھا کے الکشن (اپریل۔مئی ۱۹۹۶) میں اسی سابقہ غلطی کو پھر دہرایا۔ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست (۷ جولائی ۱۹۹۶) میں ڈاکٹر مسعود علی خان (ICSSR) نے تفصیلی تجزیہ کر کے بتایا کہ ۱۹۹۶ میں گیارھویں لوک سبھا کے

الکشن نے اس خوش فہمی کا خاتمہ کر دیا ہے کہ مسلم ووٹ توازن کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ جس پارٹی کی طرف گر جائیں اس کی کامیابی یقینی ہے۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس میں نام نہاد مسلم لیڈروں کی پوری تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ اپنی سطحیت کی بنا پر ہمیشہ انا اور وقار کی سیاست چلاتے ہیں۔ اور اسی لیے وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ ان کو یہ سادہ سی حقیقت نہیں معلوم کہ الکشن میں شرکت انا کی تسکین کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لیے کی جاتی ہے اگلے چند سالوں (نہ کہ ہمیشہ کے لیے) کمیونٹی کے مفادات کو بقدر امکان (نہ کہ مکمل طور پر) محفوظ کیا جا سکے۔ وقار کی سیاست تباہی کی سیاست ہے۔ اور بدقسمتی سے نااہل مسلم قیادت نے ہندستان کے مسلمانوں کو اسی تباہی کا تحفہ دیا ہے۔

دہلی سے بمبئی کا سفر انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۵ کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز ٹھیک وقت پر پونے چھ بجے روانہ ہوا، اور تقریباً دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد بمبئی پہنچ گیا۔ یہاں ایرپورٹ پر کئی ساتھی موجود تھے۔ ان کے ہمراہ شہر کے لیے روانگی ہوئی۔ یہاں میرا قیام ہوٹل میٹروپیلس کے کمرہ نمبر ۲۰۲ میں تھا۔

ہوٹل کے کمرہ میں تھوڑی دیر ساتھیوں سے گفتگو ہوئی۔ لوگوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد وقتی طور پر یہاں کے مسلمانوں میں الرسالہ مشن کے خلاف جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ اللہ کے فضل سے اب تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ الرسالہ کی اور کتابوں کی مانگ دوبارہ بڑھ گئی ہے۔ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ اس بحران میں وہی راستہ درست تھا جس کی رہنمائی الرسالہ میں دی گئی تھی۔

ہوٹل میں تھوڑی دیر قیام کے بعد ہم لوگ باندرہ کے جناب جاوید صاحب کے یہاں گئے۔ ان کی رہائش گاہ پر نماز عشاء کے بعد ایک میٹنگ رکھی گئی تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان تقریباً ۲۵ کی تعداد میں شریک ہوئے۔ ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ موجودہ زمانہ میں جو جدید تقاضے پیدا ہوئے ہیں وہ کیا ہیں اور ان کے درمیان رہتے ہوئے کس طرح اسلامی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ٹی وی کی صورت میں جو کلچرل انویژن ہے اس

کے خلاف چیخ پکار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو جاری رہے گا۔ ہمارے نوجوان جوان کا شکار ہو رہے ہیں اس کی اصل وجہ ان کا چیپ ٹیسٹ ہے۔ ہمیں ان کے ٹیسٹ کو اونچا کرنا ہوگا۔ مثلاً میرا اپنا حال خدا کے فضل سے یہ ہے کہ میرا انٹلکچول لیول اتنا بلند ہو چکا ہے کہ میں اس قسم کی چیزوں سے انجوائے نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں ان کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ یہی اس مسئلہ کا حل ہے۔

۲۷ جنوری کو ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا دین انٹرسٹ (مفاد) ہے۔ آج ہر آدمی، خواہ وہ ایک مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا، صرف انٹرسٹ کے ٹرم میں سوچتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا انٹرسٹ دولت ہے اور کسی کا انٹرسٹ قیادت اور مقبولیت۔ یہ مزاج اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی شخص انٹرسٹ کے خلاف بول رہا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس میں بھی اس کا کوئی انٹرسٹ شامل ہوگا۔

۲۷ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ ہوٹل میں لوگ ملاقات کے لیے آتے رہے اور ان سے ملّی اور ملکی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ جمعہ کی نماز ماڈرن ڈیری کی مسجد میں پڑھنا تھا۔ جب ہماری گاڑی ہوٹل سے مسجد کے لیے روانہ ہوئی تو راستہ میں میں نے دیکھا کہ ہمارے سامنے جو گاڑی جا رہی ہے اس کی باڈی کے پیچھے لکھا ہوا ہے محفوظ دوری پر رہو (Keep safe distance)۔ میں نے سوچا کہ یہی کامیاب زندگی کا اصول ہے۔ اس دنیا میں سڑک پر محفوظ سفر کے لیے بھی یہی واحد اصول ہے، اور زندگی کے وسیع تر سفر میں بھی یہی واحد کارآمد اصول ہے۔

ماڈرن ڈیری کی مسجد میں مولانا شمس الحق قاسمی امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہاں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ کی تقریر تھی۔ یہ بتانے کی کوشش کی کہ مسجد انسان سازی کا تربیتی مرکز ہے۔ یہاں انسان کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جاتے ہیں جو دینی اور دنیوی اعتبار سے بہتر زندگی گزارنے کی کلید ہیں۔

مسجد میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مولانا مظاہر الحق قاسمی (۲۷ سال) رُدرپور (ضلع نینی تال) میں رہتے ہیں۔ وہ کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ الرسالہ سے آپ نے کیا سبق لیا۔ انھوں نے کہا کہ مجاھدانہ زندگی۔ الرسالہ آدمی

کو مجاہدانہ زندگی گزارنے کی فکری تربیت ہے۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ بمبئی میں کس مسلم تنظیم کا زیادہ اثر ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کا نہیں۔ صرف یہ ہے کہ کوئی قومی اشو کھڑا ہوتا ہے تو اس کے نام پر کوئی تنظیم یا جماعت وقتی طور پر کچھ بھیڑ اکٹھا کر لیتی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۷ جنوری کو مغرب کی نماز آدرش نگر میں پڑھی۔ یہاں مسجد کے ساتھ ایک رہائشی مدرسہ قائم ہے۔ اس میں اس وقت ۵۰ لڑکے زیر تعلیم ہیں اور چار استاد ہیں۔ اس کو جناب جی ایم صدیقی نے بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہے ہیں۔

جی ایم صدیقی صاحب نے بتایا کہ جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ میں جب بمبئی میں فساد ہوا تو مدرسہ کے بارہ میں ہم لوگوں کو تشویش پیدا ہوئی۔ کچھ مسلمانوں نے مشورہ دیا کہ مدرسہ کے بچوں کو یہاں سے دوسرے مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ مقامی ہندوؤں کو جی ایم صدیقی اور ان کے دوستوں کی پریشانی کا علم ہوا تو یہ ہندو مسٹر صدیقی سے ملے اور کہا کہ آپ لوگ نہ پریشان ہوں اور نہ کہیں اور منتقل ہوں۔ ان کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے امن کمیٹی بنائی اور ڈیڑھ ماہ تک رات دن گھوم گھوم کر علاقہ کا پہرہ دیتے رہے۔

ایک مجلس میں جناب محمود ایوبی صاحب (صحافی) بھی تھے۔ ایک صاحب نے فسادات وغیرہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: زلزلہ آیا کرے، مکان پھر بنالیں گے۔

جناب جی ایم صدیقی صاحب نے آج رات کے کھانے پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بلایا تھا۔ یہاں تقریباً دو گھنٹہ کی نشست میں مجھے اظہار خیال کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ اسلام کی از سرِ نو تعبیر (reinterpretation) کا مسئلہ ہے۔ آج کا زمانہ پوری طرح ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ اب نئے حالات کے لحاظ سے اسلام کی ابدی تعلیمات کی از سرِ نو تشریح کرنا ہے۔ تاکہ دورِ جدید میں بھی اسلام پوری طرح ایک قابل عمل نظریہ دکھائی دینے لگے (اس معاملہ کی تفصیل "فکر اسلامی" میں دیکھی جا سکتی ہے)

مہاراشٹر کے سابقہ الیکشن پر کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا ایک سبق یہ ہے کہ الکشنی تقریریں ہمیشہ بے حقیقت ہوتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۵ کے اس الیکشن

یں بھاجپا کے لیڈر مسٹر منوہر جوشی نے اپنی انتخابی مہم میں کہا تھا کہ پہلی ہندو ریاست مہاراشٹر میں بنے گی:

The first Hindu State will be established in Maharashtra (Manohar Joshi)

اس الیکشن کے جو نتائج سامنے آئے اس کے بعد منوہر جوشی کو موقع ملا کہ وہ مہاراشٹر میں چیف منسٹر بن جائیں۔ مگر اقتدار میں آنے کے بعد ہندو اسٹیٹ بنانا تو درکنار، انھوں نے ہندو اسٹیٹ کی بات بھی نہیں کی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے الفاظ کبھی تاریخ نہیں بنتے۔ تاریخ ہمیشہ حقیقی اسباب کے زور پر بنتی ہے نہ کہ لاؤڈ اسپیکر پر بولے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر۔

ایک بار ایک سڑک پر چلتے ہوئے یہاں کا مشہور گیٹ وے آف انڈیا نظر آیا۔ یہ ایک تاریخی گیٹ ہے۔ انگریز بمبئی میں سمندر کے راستہ سے داخل ہوئے تھے۔ یہاں سمندر کے ساحل پر انھوں نے ایک اونچا گیٹ بنایا جو گیٹ وے آف انڈیا کہا جاتا ہے (دوسرا گیٹ نئی دہلی میں بنایا گیا جس کا نام انڈیا گیٹ ہے) یہ گیٹ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بنایا گیا
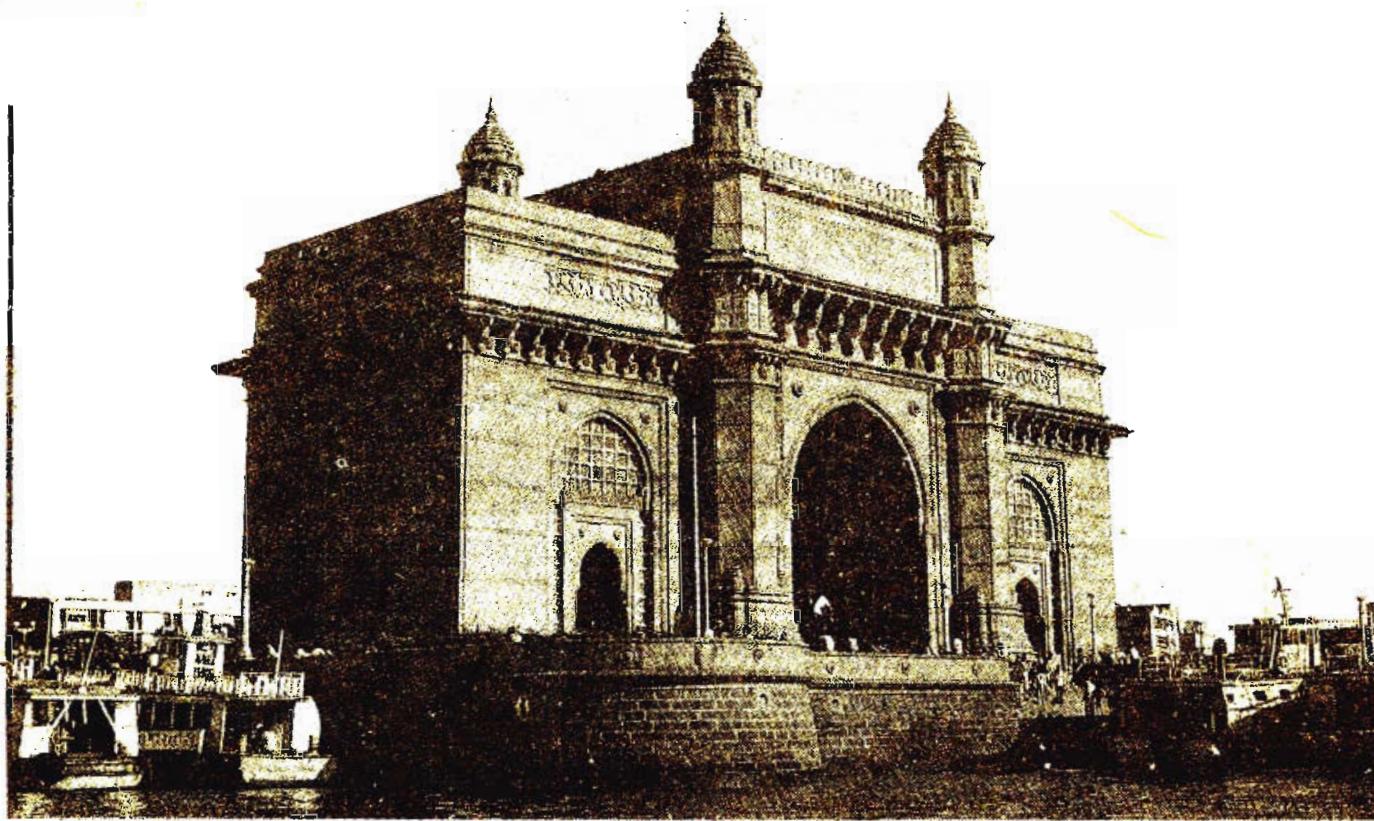
The Gateway of India, Bombay, early 20th century

تھا۔ جب وہ بنایا گیا، اس وقت وہ انگریز کے داخلۂ ہند کا پُرعظمت نشان تھا۔ آج وہ عملی طور پر انگریز کی ملک سے واپسی کی پُرحسرت یادگار بن چکا ہے۔

یہی اس دنیا کے لیے خدا کا تاریخی قانون ہے۔ اس قانون میں کسی کا استثنار نہیں، خواہ وہ ایک قوم ہو یا کوئی دوسری قوم۔

۲۷ جنوری کو صبح سویرے نیند کھل گئی۔ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تک ٹہلتا رہا۔ ہوٹل کے پاس بچوں کا ایک اسکول ہے۔ اس سے بندے ماترم کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ انسان بھی کیسا عجیب ہے جو مخلوق کی حمد گاتا ہے، لیکن خدا کی حمد گانے کی تڑپ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

چائے پینے کے بعد باتھ روم گیا۔ میرا معمول ہے کہ صبح کو فراغت کے بعد وضو کرتا ہوں اور پرسکون کے عالم میں دو رکعت نماز ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ آج صبح ۸ بجے ہوٹل کے کمرہ میں حسب معمول نیت باندھ کر کھڑا ہوا تو قرآن کا ایک حصہ پڑھتے ہوئے اچانک آواز بلند ہوگئی۔ میں تقریباً گونج دار آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔ یہ ایک قسم کا غیر شعوری عمل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کے مشرکانہ شور وغل کو سن کر میرا جذبۂ توحید جاگ اٹھا اور بے ساختہ طور پر میں کتاب توحید کو اعلان کے انداز میں اپنی زبان سے دہرانے لگا۔

۲۸ جنوری کی صبح کو ۸ بجے ایک پروگرام تھا۔ یہ نیشنل ویمنز پالی ٹکنک (قائم شدہ ۱۹۸۰) میں تھا۔ یہاں لڑکیوں کی تعداد تقریباً ۷۰۰ ہے۔ خواتین ٹیچر کی تعداد ۲۵ ہے۔ یہ مسٹر جی ایم صدیقی کی محنتوں سے قائم ہوا ہے۔ یہاں ہوم سائنس کے مختلف موضوعات پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں سلائی سے لے کر کمپیوٹر تک تمام ضروری فنون شامل ہیں۔

اس کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ چنانچہ یہاں کے ایک ایجوکیشن افسر نے ایک بار مسٹر جی ایم صدیقی کو بلایا۔ اس نے کہا کہ ہم اکثر اسکول کے ذمہ داروں کو شکایت کے لیے بلاتے ہیں۔ مگر آپ کو ہم نے اس لیے بلایا ہے کہ ہم آپ کے کام کا اعتراف اور قدر دانی کریں۔

یہ بچیاں زیادہ تر کم آمدنی والے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ نسیم علی خان صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ آمدنی کا کوئی تعلق تعلیم سے نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک

سبق آموز واقعہ سنایا۔ نومبر ۱۹۹۳ میں لاتور کے علاقہ میں سخت زلزلہ آیا جس میں بستیاں تباہ ہوگئیں۔ اس میں جو لوگ بری طرح متاثر ہوئے ان میں سے ایک ۱۶ سالہ لڑکا سنجے تھا، اس کا گھر تباہ ہوگیا۔ اس کے باپ نے بستی سے باہر جنگل میں ایک معمولی ٹینٹ میں اس کو رکھ دیا۔ سنجے کے حالات آخری حد تک خراب ہو گئے تھے۔ مگر یہی لڑکا ہے جس نے اُس سال ہائی اسکول کے امتحان میں پورے مہاراشٹر میں ٹاپ کیا۔

سنجے نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ جنگل کے ٹینٹ میں جانا میرے لیے ایک ایڈوانٹج بن گیا۔ وہاں کوئی دوست یا رشتہ دار ملنے والا نہیں تھا، نہ ٹی وی جیسی کوئی اور چیز، اس طرح سارا وقت پڑھنے کے لیے مل گیا۔ نسیم صاحب نے جگہ کا نام بتائے بغیر یہ قصہ سنایا۔ پھر طالبات سے پوچھا کہ بتایئے یہ بچہ کہاں کا تھا۔ ایک لڑکی زینت نے اٹھ کر کہا کہ لاتور کا۔ جناب اقبال صاحب نے فوراً پچاس روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور اس لڑکی کو بطور انعام دیا۔

میں نے اپنی تقریر میں تعلیم کی اہمیت بتائی۔ میں نے کہا کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ گویا خدا کا ایک پودا ہے۔ اس کو بڑھ کر پورا درخت بننا ہے۔ پودے کو درخت بنانے کا یہ عمل تعلیم کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ تعلیم کا یہ کام بے حد نازک بھی ہے اور بے حد اہم بھی۔ ضرورت ہے کہ اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا جائے۔

تقریب کے بعد ہم لوگوں کو مدرسہ کی کلاسیں دکھائی گئیں۔ ایک بعد ایک تمام کلاس دیکھیں۔ اس دوران ہم لوگ جب کسی کمرہ میں داخل ہوتے تو وہاں کی طالبات کھڑی ہوجاتیں اور بلند آواز سے کہتیں السلام علیکم۔

مگر ایک کمرہ میں ایسا نہیں ہوا۔ ہم لوگ حسب معمول اس کے اندر داخل ہوئے۔ لیکن تمام لڑکیاں اپنی اپنی میز پر جھکی ہوئی لکھنے میں مشغول رہیں۔ کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ اٹھ کر ہم کو سلام کرے یا ہماری طرف دیکھے۔

میں نے جاننا چاہا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اِس کمرہ میں جو لڑکیاں تھیں وہ دراصل ٹیسٹ دے رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت ہے، وہ ایک منٹ کھوئے بغیر اپنے اس وقت کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہی ہر

انسان کا معاملہ ہے ، اگر انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ ایک خدائی ٹیسٹ دے رہا ہے، اورصرف محدود مدت ہی اس کو حاصل ہے تو وہ مذکورہ لڑکیوں سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو جائے گا۔

آفتاب احمد صاحب باندرہ میں کلثوم کتاب گھر چلاتے ہیں۔ یہ کتاب گھر عملاً الرسالہ اور الرسالہ کی مطبوعات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ایک بار کچھ مخالفین نے انھیں دھمکی دی کہ تم الرسالہ اور الرسالہ کی مطبوعات کا کام بند کرو، ورنہ ہم کتاب گھر میں آگ لگا دیں گے۔ آفتاب احمد صاحب نے کہا کہ بہت اچھا۔ آپ آئیے، میں اپنی طرف سے آپ کو پانچ لیٹر تیل فری دوں گا۔ انھوں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ اس لیے کہ اس سے تو ہماری پبلسٹی ہوگی۔ ہمارا کام اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ وہ شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

۲۸ جنوری کی شام کو حسب ذیل افراد ملاقات کے لیے ہوٹل میں آئے :

مسٹر بی این جوگ، مسٹر دلیپ کورم بیلکر، مدھو دیولیکر، گوپال بلی رام۔ یہ سب کٹّر ہندو حلقہ سے تعلق رکھتے تھے اور صحافی تھے، دیر تک باتیں ہوئیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آج کا مسلم نوجوان کس طرح سوچتا ہے۔ نسیم علی خاں صاحب نے کہا کہ آج کے مسلم نوجوانوں کی سوچ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب بہت سے مسلمان پاکستان چلے گئے تو ہم نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اس ملک کے لیے قربانی دی۔ مگر ہندو لوگوں کی طرف سے ہمیں کوئی قدر دانی نہیں ملی۔

ایک ہندو نے کہا کہ آپ کی سوچ یہ ہے کہ آپ نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کر کے قربانی دی ہے۔ دوسری طرف ہندو نوجوان کی سوچ یہ ہے کہ دیش کے بٹوارہ کے وقت مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کر لیں گے ہندستان۔ اسی لیے آپ لوگ یہاں ٹھہر گئے تاکہ لڑ کر ہندستان کو لے سکیں۔ میں نے سوچا کہ دونوں طرف کس طرح دو مختلف سوچ الگ الگ چل رہی ہے۔ اس کا علاج ہیجی پکار نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ میل ملاپ ہے۔ اس غلط فہمی کو میل ملاپ ہی کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر جوگ (پیدائش ۱۹۲۴) ہندوؤں کے انتہائی کٹّر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ آر ایس ایس کے سرگرم ممبر ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب یہ ہے :

B.N. Jog, Threat of Islam; Indian Dimensions Unnati Prakashan, Bombay 1994

۴۸۵ صفحہ کی یہ کتاب پوری کی پوری اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندستان میں آکر زبردستی یہاں کے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ اب اس کا واحد حل یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو دوبارہ ان کے سابق مذہب کی طرف واپس کر دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دونوں عمل میں فرق یہ ہوگا کہ ابتدائی تبدیلیٔ مذہب (کنورژن) جبر کے ذریعہ ہوا، اب دوبارہ تبدیلیٔ مذہب (reconversion) ان کے آزاد ارادہ کے تحت ہوگا (صفحہ ۴۸۲)

کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے میں نے مسٹر جوگ کو لکھا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو بمبئی آرہا ہوں اور فلاں جگہ میرا قیام ہوگا۔ اس کے مطابق وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملنے کے لیے آئے۔ میں نے ان سے بالکل معتدل انداز میں گفتگو کی۔ کسی قسم کی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھ لی ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلم حکمرانوں نے ہمیشہ ہندو کے اوپر ظلم کیا اور انھیں زبردستی مسلمان بنایا۔ یہی تمام مسائل کی اصل جڑ ہے، اور اب اس کا حل صرف ری کنورژن ہے، یعنی ان مسلمانوں کو دوبارہ ان کے قدیم مذہب کی طرف واپس لوٹانا۔

مگر کتاب میں یہ بات دعویٰ کی زبان میں کہی گئی ہے۔ اس کے حق میں کوئی تاریخی دلیل نہیں دی گئی ہے۔ جب کہ تمام بڑے مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ جبری تبدیلیٔ مذہب کی بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً انگریز مورخ ڈاکٹر ٹائٹس (Titus) نے لکھا ہے کہ ہندستان میں اسلام کا داخلہ ایک پُرامن داخلہ (Peaceful Penetration) تھا۔ یہی بات خود سوامی ویویکانند نے لکھی ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کہنا ایک لغو بات (nonsense) ہے کہ ہندستان میں جبری کنورژن ہوا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر ہندستان کی تعمیر و ترقی کی پہلی شرط یہ ہے کہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنایا جائے تو پھر یہ ترقی کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ جن ہندوؤں نے آپ کے بقول، جبر کے تحت اپنا مذہب بدلا تھا وہ سیکڑوں سال پہلے تھے۔ موجودہ مسلمان تو ان کی بہت

بعد کی نسلیں ہیں۔ اور نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کوئی گروہ اپنا مذہب بدلتا ہے تو بعد کی نسلوں کے لیے وہ ان کا فخر بن جاتا ہے۔ موجودہ مسلم نسلوں کے لیے اسلام ان کا فخر ہے۔ اور دوبارہ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی گروہ اپنے فخر کو کبھی نہیں چھوڑتا۔

پچھلے پچاس برس میں اس نظریہ کے ماننے والوں نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کی حد تک جاکر زبردست تحریک چلا رکھی ہے، مگر وہ کسی بھی مسلمان کو "ری کنورٹ" کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مسلمان توحید کو اپنا فخر بنا چکے ہیں اور اب وہ ری کنورژن کو توحید سے شرک کی طرف واپسی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کو ان کا فخر چھوڑنے پر راضی کیا جاسکے۔ پھر وہ کون سی تدبیر ہے جس کے ذریعہ اس ناممکن کو ممکن بنایا جاسکے گا۔

مسٹر جوگ نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ ان کے چہرہ سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے موقف کی کمزوری پر وہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔

جناب ہارون شیخ صاحب نے بتایا کہ ضیاء الدین خلیفہ (۸۰ سال) انجمن ہائی اسکول میں پرنسپل تھے۔ ان کا ایک تجربہ بہت سبق آموز ہے۔ ان کا طریقہ تھا کہ وہ کلاس کا معائنہ کرتے اور لڑکوں کا جائزہ لیتے۔ جس طالب علم کو دیکھتے کہ وہ سب سے زیادہ شریر ہے، اسی کو کلاس کا مانیٹر بنا دیتے۔ اور وہ لڑکا بہترین مانیٹر ثابت ہوتا تھا۔

میں نے کہا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ شریر آدمی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور جو آدمی میٹھی باتیں کرے اس کو اچھا سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ شریر آدمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر منافق ہے۔ اور غیر منافق آدمی ہی ہمیشہ کام کا ہوتا ہے۔ منافق آدمی سے آپ کسی بھی کام کی امید نہیں کر سکتے۔

جناب نسیم علی خاں صاحب نے ضیاء الدین خلیفہ صاحب کا ایک اور تجربہ بتایا۔ انھوں نے انجمن اسلام کے تحت انگلش میڈیم کا ایک اسکول کھولا اور اردو کو اس میں سکنڈ لینگویج بنا دیا۔ انجمن اسلام کے تحت جو خالص اردو میڈیم اسکول چل رہے ہیں ان کے معیار کے بارہ میں عام طور پر لوگوں کو شکایت ہے۔ اس کے برعکس انگلش میڈیم اسکول (اردو سکنڈ لینگویج کے ساتھ) کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ نسیم علی خاں صاحب نے کہا کہ اردو میڈیم والوں کے سامنے دوسرے اردو میڈیم اسکول ہوتے تھے۔ اس بنا پر ان میں مقابلہ کا جذبہ

پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب کہ انگلش میڈیم والوں کے سامنے مقابلہ کے لیے انگلش اسکول ہوتے ہیں جو نہایت اعلیٰ معیار پر چلائے جا رہے ہیں۔ اس بنا پر انگلش میڈیم کا معیار اپنے آپ زیادہ اونچا ہو جاتا ہے۔

میرے کمرہ میں ٹائمس آف انڈیا کا بمبئی ایڈیشن (۲۶ جنوری) موجود تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر ایک نمایاں چار کالمی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ گاندھی سمادھی کی تقریب سے فراغت کے بعد مسٹر نیلسن منڈیلا ایک کرسی پر تعجب خیز مسرت کے انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور مرکزی وزیر مسٹر جگدیش ٹائٹلر ان کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ کر ان کو جوتا پہنا رہے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا :

South African President Nelson Mandela being helped by Union surface transport minister Jagdish Tytler to tie his shoes after laying a wreath at Gandhi samadhi in New Delhi on Wednesday. Rochell Mitirara, grand-daughter of Mr. Nelson Mandela, looks on.

یہ نیلسن منڈیلا کی قربانیوں کی قیمت ہے۔ وہ ۱۹۱۸ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ساؤتھ افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کی آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں گزرا۔ یہاں تک کہ لمبی پُر مشقت جدوجہد کے بعد ۱۹۹۳ میں وہ ساؤتھ افریقہ کے پہلے بلیک پریسیڈنٹ بنائے گئے۔ یہ ایک شخص کی قربانیوں کی وہ قیمت ہے جو دنیا میں اسے ملی۔ اسی طرح کچھ اللہ کے بندے آخرت کے لیے قربانیاں دیں گے۔ اور پھر شاندار تر انداز میں وہ وہاں اس کی ابدی قیمت پائیں گے۔

بھارتیہ ودیا بھون کا جلسہ ۲۹۔۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو تھا۔ وہ بھون کی وسیع عمارت کے ہال میں ہوا۔ بمبئی کے حلقۂ الرسالہ کی طرف سے اس موقع پر الرسالہ کا اور کتابوں کا اسٹال لگایا گیا۔ بہت سے لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور اپنے لیے حاصل کیں۔

دو روزہ اجلاس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں، اور موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ میری تقریر ۳۰ جنوری کو تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانی سماج وہی ہے جو اقدار (respect) پر مبنی ہو۔ جس سماج میں اقدار مٹ جائیں وہ حیوانی

سماج ہے، اس کے بعد اس کو انسانی سماج نہیں کہا جا سکتا۔

پھر میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں جتنی بھی بڑی تحریکیں اٹھیں وہ سب روایت شکنی کی بنیاد پر اٹھیں، اور روایت شکن تحریکیں اٹھانا ہی اقدار کو توڑنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں اٹھنے والی تحریکیں ہی اگر سب کچھ ہوتیں تو اب تک ہمارے ملک میں اقدار کا یکسر خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ مگر خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ اقدار کا احترام خود انسانی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی انسانی فطرت ہے جس کی بنا پر آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں اقدار کا تصور ہمارے سماج میں باقی ہے۔

میں نے کہا کہ ہماری تعلیم گاہیں، ہمارا میڈیا، ہماری مجلسیں، غرض ہماری تمام فکری سرگرمیوں کو اقدار رخی ہونا چاہیے۔ یہی کسی سماج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سماج کے اندر اگر اقدار کا تصور زندہ ہو تو بقیہ مطلوب چیزیں اپنے آپ زندہ ہو جائیں گی۔ اور اگر اقدار مٹ جائیں تو بقیہ مطلوب چیزیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں نے کہا کہ سو سال پہلے سوامی ویویکانند امریکہ گئے۔ ایک روز وہ وہاں شہر کی ایک سڑک پر چل رہے تھے۔ اس دوران ایک امریکی مرد اور عورت قریب سے گزرے۔ سوامی جی حسب معمول سادہ قسم کے گیروے لباس میں تھے۔ ان کو یہ لباس کچھ غیر مہذب دکھائی دیا۔ عورت نے اپنے مرد ساتھی سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ یہ شخص کوئی جنٹل مین دکھائی نہیں دیتا۔ سوامی ویویکانند نے اس کی یہ بات سن لی۔ سوامی جی آہستہ چل کر ان کے قریب گئے اور کہا کہ خاتون محترم، مجھے معاف کیجئے۔ آپ کے دیس میں درزی کسی آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے۔ مگر میں جس دیس سے آیا ہوں، وہاں کیرکٹر کسی آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے:

Excuse me Madam. In your country tailor makes a man gentleman, but in the country from which I come character makes a man gentleman.

سو سال پہلے ایک ہندستانی امریکہ میں جا کر یہ بات کہہ سکتا تھا۔ مگر آج کوئی ہندستانی باہر کے دیس میں اس قسم کی بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ امریکہ کے ایک سفر میں میں نے ایک امریکی پروفیسر سے سوامی ویویکانند کا یہ واقعہ بیان کیا۔ اس نے جواب دیا کہ سو سال پہلے تمہارا

انڈیا ایسا ہی ہوگا۔ لیکن آج کے انڈیا کے لیے کیرکٹر کی بات ایک اکسپورٹ آئٹم ہے وہ لوکل کنزمپشن کی چیز نہیں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے جتنے بھی رہنما ہیں، مثلاً سید جمال الدین افغانی، محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، سید قطب، سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید ابوالحسن علی ندوی، ان میں سے ہر ایک نے امت کے احیار کا راز یہ سمجھا کہ امت کے اندر امامت اور قیادت کا شعور جگایا جائے۔ مگر یہ الٹی خوراک تھی۔ کوئی بھی نظام، خواہ وہ سیکولر ہو یا دینی، ایسے لوگوں کے درمیان نہیں چل سکتا جہاں ہر شخص قائدانہ حوصلہ اپنے سینہ میں لیے ہوئے ہو۔ ایک لاکھ آدمی ہوں تو ۹۹۹۹۹ آدمی کو مقتدی بننا پڑتا ہے تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص آگے کھڑے ہو کر ان کی امامت کرے۔ یہ سبق جو ہر روز نماز میں دیا جاتا ہے یہی کامیاب نظام کا راز بھی ہے۔ جس سماج کے لوگ ماتحتی قبول کرنے پر راضی ہوں انھیں کے یہاں کوئی صحیح نظام اقتدار قائم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں ہر آدمی حاکم بننا چاہتا ہو وہاں وہی خلفشار وجود میں آتا ہے جو آج ہمارے ہر ادارہ میں چھوٹی سطح پر، اور افغانستان اور پاکستان جیسے ملکوں میں زیادہ بڑی سطح پر دکھائی دے رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے پوری ملت کو قیادت پسند ملت بنا دیا ہے۔ یہی تمام باہمی جھگڑوں کی جڑ ہے۔ اگر نماز باجماعت والی اسپرٹ لوگوں کے اندر جگائی جاتی تو تمام لوگ اقتدار پسند ہوتے اور پھر اپنے آپ وہ چیز وجود میں آجاتی جس کو متحدہ طاقت کہا جاتا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کے فوراً بعد میں بمبئی گیا تھا جب کہ وہاں فساد ہو گیا تھا اور ابھی کرفیو نافذ تھا۔ اس موقع پر پولیس کی خصوصی اجازت سے مدھو مہتا (وفات ۲۷ اگست ۱۹۹۵) وغیرہ نے ایک جلسہ کرایا، اس موقع پر اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:

"بمبئی کے بھائیو اور بہنو، ہم ایک ایسے وقت میں آپ کے پاس آئے ہیں جب کہ آپ ایک بڑے صدمہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس دعاؤں اور آنسوؤں کے سوا کوئی اور چیز دینے کے لیے نہیں۔ اس جنونی دور میں آپ کا جو نقصان ہوا اس کو میں آپ کی طرف لوٹا نہیں سکتا۔ مگر میرے پاس زندگی کا ایک پیغام ہے اور زندگی کا

پیغام بلاشبہ موت کی خبر سے زیادہ بڑا ہے۔ میرے پاس مادی طاقت نہیں مگر میرے پاس اخلاقی طاقت کا نسخہ ہے۔

عُسر یُسر: اس دنیا میں ہمیشہ پرابلم کے ساتھ سولیوشن موجود ہوتا ہے۔ اجودھیا کے واقعہ میں بھی مائنس پوائنٹ کے ساتھ پلس پوائنٹ موجود ہے۔

زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ آگ جلاتی ہے، اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ یہاں پانی ہے جس سے ہم آگ کو بجھا سکتے ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ جسم کو زخم لگتا ہے، زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ جسمانی نظام میں سیلنگ پراسس ہے جو زخم کا اندمال کرتا ہے۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ درخت کے پتے جھڑتے ہیں، زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ دوبارہ ہری پتیاں نکل آتی ہیں۔"

موجودہ سفر میں اندازہ ہوا کہ میرا مذکورہ اندازہ اب بمبئی میں ایک واقعہ بن چکا ہے۔ ۶ دسمبر کا حادثہ یہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا۔ آج وہ ہر لحاظ سے پہلے سے زیادہ بہتر ہیں۔

یکم فروری ۱۹۹۵ کی صبح کو بمبئی سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایرلائنز کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں کچھ اخبارات دیکھے۔ ایک اخبار میں ایک پرائیویٹ ایرلائنز کا اشتہار تھا۔ اس میں ایرلائنز کے بارے میں مختلف تفصیلات دی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ "آج ہم بھارت کے مختلف حصوں سے روزانہ ۲۵ مقامات سے ۲، کمرشیل پروازیں کرتے ہیں"۔ اس میں مزید بتایا گیا تھا کہ:

"ہر قسم کی خرابی سے مبرّا دس طیاروں کا شاندار بیڑا جس کی بہترین نگہداشت کے لیے ہی ایک کرور امریکی ڈالر کے فاضل پرزے اسٹاک کیے گئے ہیں"

یہ زندگی کا ایک قانون ہے جس کا تعلق صرف ہوائی جہاز سے نہیں ہے بلکہ تمام معاملات سے ہے۔ جو لوگ پیشگی تحفظ کی اس تدبیر کو اختیار کر سکیں وہی اس دنیا میں کامیابی کے ساتھ منزل پر پہنچتے ہیں۔ اسی کو شاعر نے ان لفظوں میں بیان کیا:

سفینہ بنا رکھیں طوفان سے پہلے

اکانومک ٹائمس میں ساؤتھ افریقہ کے بارے میں تفصیلی معلومات تھیں، جس کے صدر مسٹر نیلسن منڈیلا آج کل نئی دہلی آئے ہوئے ہیں۔ ۲۵ جنوری کی شام کو راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے ہال میں ان کی تقریر تھی۔ اس میں میں بھی خصوصی دعوت کے تحت شریک تھا۔

مذکورہ اخبار کے صفحہ ۲۱ پر ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ساؤتھ افریقہ کی وزارت خارجہ کے مسلمان ڈپٹی منسٹر مسٹر عزیز (Aziz Pahad) فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے پریسیڈنٹ مسٹر اے کے رُنگتا سے دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کے مسئلہ پر مصروف گفتگو ہیں۔

میں نے سوچا کہ یہی مسلمانوں کے لیے صحیح طریقہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ عقیدہ اور مذہب کے معاملہ میں وہ اپنے علاحدہ تشخص کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ اور اسی کے ساتھ ملکی مسائل میں وہ یکساں طور پر رہنمائے وطن کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ بیک وقت پورے معنی میں مسلمان بھی ہوں اور پورے معنی میں ہندستانی بھی۔

۱- فرینکفرٹ یونی ورسٹی (جرمنی) کے ایک اسکالر جرجین اسٹین (Jürgen Stein) ہندستان کے کاسٹ سسٹم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس کے تحت وہ مسلم سماج کا بھی مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کو جو باتیں بتائی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ فرق نیچر کا ایک قانون ہے۔ فرق سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مسابقت ترقی کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں انھیں قرآن کی بعض آیتیں بتائی گئیں جس کو انھوں نے بہت پسند کیا۔ مثلاً الزخرف ۳۲، آل عمران ۱۴۰۔

۲ کناڈا کے ایک ریسرچ اسکالر پراؤڈفٹ (D.S. Proudfoot) ہندستان میں فرقہ وارانہ تعلقات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ مسلم نقطۂ نظر سے ان کو ضروری معلومات دی گئیں۔ یہ انٹرویو انھوں نے ۸ انومبر ۱۹۹۷ کو لیا۔

۳- نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ۲۳ نومبر ۱۹۹۷ کو گلوبل اتھکس پر ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اخلاقیات کے موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اس کانفرنس کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔

۴- ۲۱-۲۲ نومبر ۱۹۹۷ کو پونہ میں ایک بین اقوامی اجتماع ہوا۔ جس کا عنوان تھا: ورلڈ کنونشن آن ریورنس فار آل لائف۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور احترام انسانیت کے موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اس اجتماع کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔

۵- اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کے تحت ۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو متھرا ریفائنری (متھرا) میں سرودھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے اعتبار سے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس سمّیلن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔

۶- سوادھیائے موومنٹ کے ایک پروگرام کے تحت ۲۸-۲۹ نومبر ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز نے ناندیڑ اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس دوران ملاقات اور تقریر کی صورت میں اسلام کے مثبت تعارف کی کوشش کی گئی۔ لوگوں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ سنا اور کہا کہ ہماری

بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔

۷۔ ہمدرد پبلک اسکول (نئی دہلی) میں ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اسکول کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلام کی مثبت تعلیمات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۸۔ نوئیڈا کے کمیونٹی سنٹر میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور انسانی احترام کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ صبر کب تک۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صبر مرتے دم تک۔ صبر ایک عبادت ہے۔ جس طرح نماز ساری عمر پڑھی جاتی ہے اسی طرح صبر بھی ساری عمر کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اسی طرح صبر بھی ایک عبادت ہے۔ قرآن میں دونوں کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔

۹۔ صدر اسلامی مرکز نے کلکتہ، مرشد آباد، برہم پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ دورہ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۷ کو شروع ہوا اور ۲۴ دسمبر کو واپسی ہوئی۔

۱۰۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع یہ تھا ——— انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رمضان کے اثرات۔ احادیث کی روشنی پر ۱۲ منٹ اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱۔ بہار پردیش مسلم کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بوکارو کا سفر کیا۔ ۲۷-۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ کو وہاں ملاقات اور خطابات کے مختلف پروگرام ہوئے۔ دو تقریروں کا موضوع یہ تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام، مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔

۱۲۔ بتاریخ ۲۹ - ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۹۷ کو بمبئی میں تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع منعقد کیا گیا۔ جس میں الرسالہ فورم بمبئی کی جانب سے بک اسٹال لگایا گیا۔ اور لوگوں نے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا اور کافی کتابیں خریدیں۔

۱۳۔ بی بی سی (ٹی وی) کی ٹیم نے ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا

تعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ کیا ہندستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندو پارٹیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ جواب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ خطرہ کی بات بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا۔

۱۴۔ جموں میں ۱۸۔۱۹۔۲۰ جنوری ۱۹۹۸ کو ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس کو یونیسکو کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اور موضوع تھا —— امن عالم۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اس موقع پر اسلام اینڈ نان وائلنس کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ۱۹ جنوری کو ہوٹل ایشیا کے ہال میں ہوئی۔ اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک تھے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

اُردو

تذکیرالقرآن جلد اول	200/-
تذکیرالقرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	55/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
رازِ حیات	65/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکرِ اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دین انسانیت	60/-
شتمِ رسول کا مسئلہ	40/-
مطالعۂ سیرت	–
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	–
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویرِ ملت	85/-
دعوتِ اسلام	50/-
دعوتِ حق	40/-
نشری تقریریں	65/-
اسفارِ ہند	–
اسلام ایک تعارف	–
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	–
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	–
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	–
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	–
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوپتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوتر جیون	8/-

A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	—
An Islamic Treasury of Virtues	—
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	95.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00

Finest collection of books on Islam

RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98